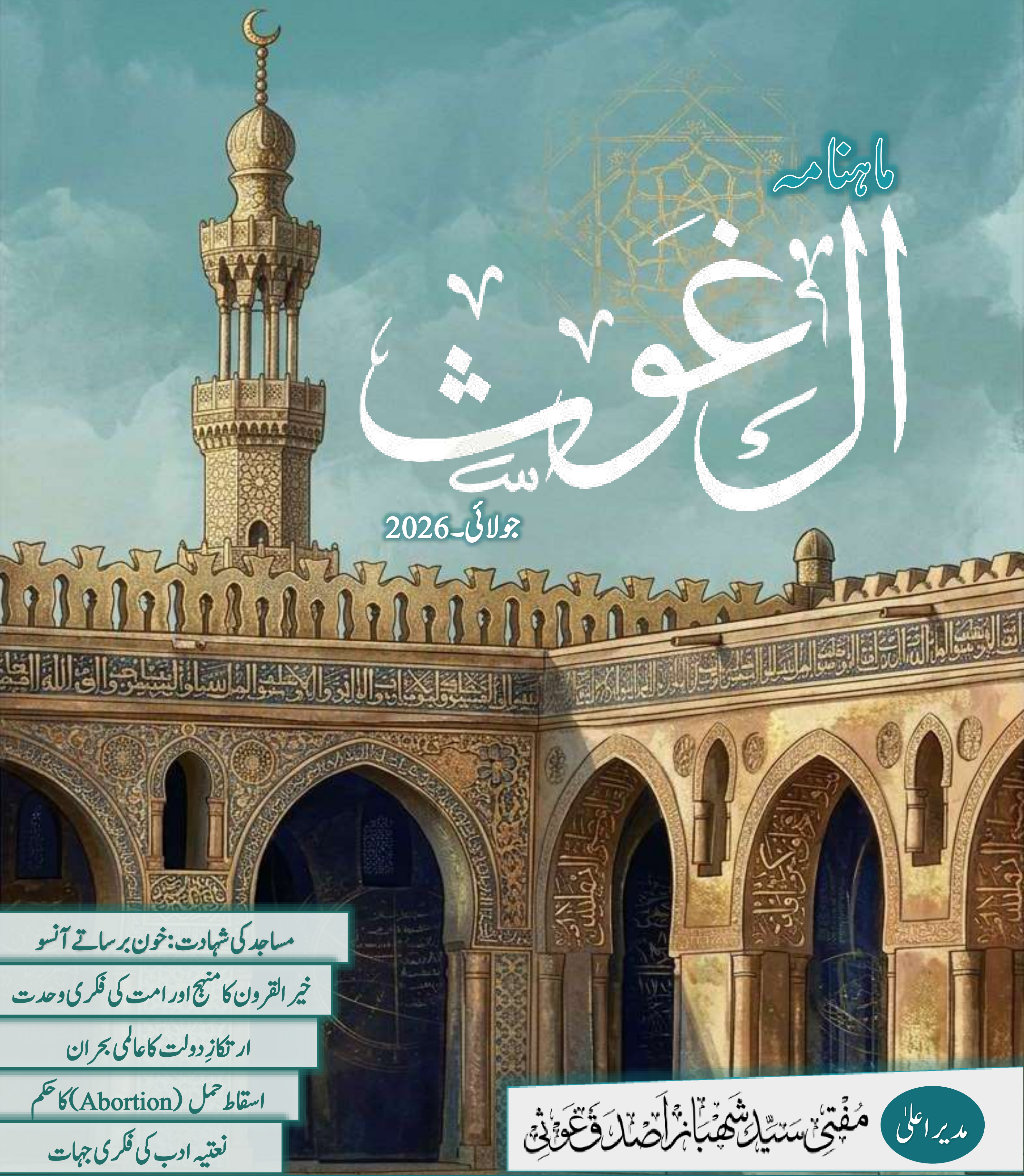


اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان

ماہنامہ

الغوث

جولائی-2026

مساجد کی شہادت: خون برساتے آنسو

خیر القرون کا منہج اور امت کی فکری وحدت

ارتکازِ دولت کا عالمی بحران

اسقاط حمل (Abortion) کا حکم

نعتیہ ادب کی فکری جہات

مدیر اعلیٰ
مفتی سید شہباز اصدق غوثی

ناشر
خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

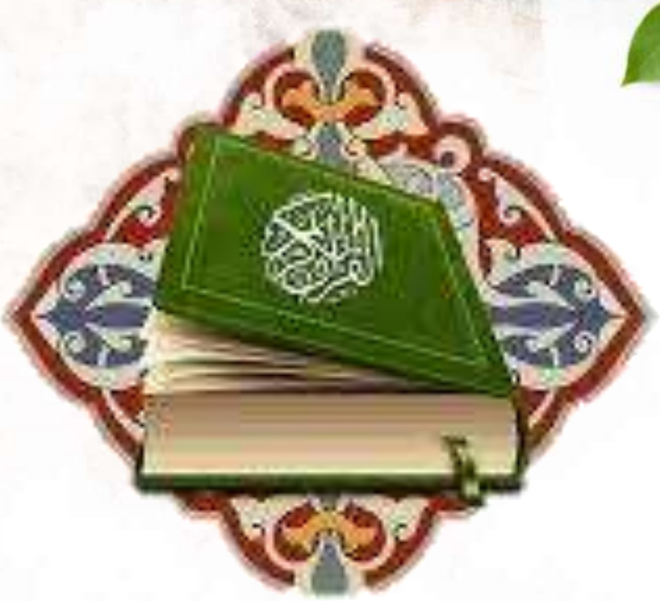
زیر سرپرستی: وارث مسند غوثیہ سید شاہ عارفین اصدق غوثی شہودی چشتی قادری صاحب

اہل سنت کا دینی علمی روحانی ترجمان



ماہنامہ
الغوث

صفر المظفر ۱۴۴۷ھ
جولائی 2026



مدیر اعلیٰ
مفتی سید شہباز اصدق غوثی

خانقاہ غوثیہ شہودیہ اصدقیہ سہسرام روہتاس بہار الہند

مشمولات

نوٹ: مضمون نگار اپنے قیمتی مضامین ہمیں درج ذیل واٹس ایپ نمبر یا ای میل پر ارسال کریں۔

ssasdaque@gmail.com +27838463037

تزئین و ترتیب

الحمد گرافکس

ماہنامہ

الغوث

جلد: 1، شمارہ: 7۔ جولائی 2026
صفر المظفر ۱۴۴۷ھ

مدیر اعلیٰ:
مفتی سید شہباز اصدق
+27838463037

معاونین
مولانا تبارک حسین امجدی
مفتی سبحان رضا امجدی

رفقائے ادارہ
حضرت علامہ
سید محمد علیم الدین اصدق مصباحی صاحب
(ساؤتھ افریقہ)
حضرت علامہ افتخار احمد قادر مدنی صاحب
(مدینہ منورہ)
حضرت پروفیسر سید شمہا نجیب گیلانی صاحب
(انڈیا)

ناشر
خانقاہ غوثیہ اصدقیہ، سہسرام، روہتاس بہار
09097467826

ای میل
ssasdaque@gmail.com

نوٹ
اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے ادارہ اور ایڈیٹر کا متفق ہونا ضروری نہیں

احباب خانقاہ کے نمبر پر رابطہ کر کے ہر ماہ رسالہ مفت حاصل کریں۔

گزارش
علم دوست حضرات Rs786 کے ذریعہ اعزازی ممبری فیس قبول کر کے اس علمی کام میں ادارہ کی مدد کر سکتے ہیں



نعت سید عالم ﷺ

نعت

از: تاج الشعراء حضرت سید شاہ اکبر داناپوری علیہ الرحمہ

جاتی ہی نہیں دل سے تمنائے مدینہ
پھرتا ہے مری آنکھوں میں صحرائے مدینہ

مقصد یہی میرا ہے گر شرط ادب سے
لب پر نہیں آتا کہ ہوں شیدائے مدینہ

دل میں ہے کہ مر کر بھی نہ نکلیں گے وہاں سے
اب کے ہمیں تقدیر جو دکھلائے مدینہ

سودا ہو جو سر میں تو مدینہ کے سفر کا
ہو عشق تو شہ والائے مدینہ

ہر مرتبہ بڑھتا ہی گیا ولولۂ شوق
کیا لطف دکھاتی ہے تمنائے مدینہ

کعبے گیے تھے ڈھونڈھنے ہم ہند سے جس کو
تھا دل میں وہی انجمن آرائے مدینہ

کعبہ سے میرا خانۂ دل کم نہیں اکبرؔ
روشن ہے یہاں شمع تجلائے مدینہ

اوصاف محمد کے ترانے ہیں سخن میں
قرطاس پہ خامہ ہے کہ بلبل ہے چمن میں

اوصاف براق شہ دیں ہو نہیں سکتے
اک برق تھی جو کوند گئی چرخ کہن میں

ہے کیا عجب آنکھوں میں بیٹھائیں مجھے حوریں
جل پِس کے ہوا سرمہ محبت کی جلن میں

پھر عشق گلا دے گا مجھے شمع کی صورت
پھونکا ہے جگر آگ لگا دی ہے بدن میں

اشکوں میں ٹپکتے ہیں شرر سوزش غم سے
لو آگ برسنے لگی بھادوں کی بھرن میں

نعلین کے موتی ہیں بنے گوہر انجم
زینت ترے قدموں سے ہوئی چرخِ کہن میں

ہے اس گلِ وحدت کے پسینے سے محبت
اس عطر کا شیشہ ہے مرے رکھ دینا کفن میں



مساجد کی شہادت: خون برساتے آنسو

مفتی سید شہباز اصدق

اداریہ

ہندوستان، جو اپنی تہذیبی رنگارنگی اور مذہبی تنوع کے باعث دنیا بھر میں منفرد مقام رکھتا ہے، وہاں مسلمان ہندوؤں کے بعد دوسری سب سے بڑی آبادی پر مشتمل مذہبی برادری ہیں۔ اس قوم کی اپنی دینی شناخت، زبان، تہذیب، ثقافتی روایات، تاریخی ورثہ اور ایک نہایت شاندار ماضی ہے۔ ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے مساجد، مزارات، مدارس اور دیگر تاریخی آثار نہ صرف اسلامی تہذیب کی عظمت کے آئینہ دار ہیں بلکہ اپنی تعمیراتی خوبصورتی اور جمالیاتی کشش کے باعث دنیا بھر کے سیاحوں اور محققین کی توجہ کا مرکز بھی رہے ہیں۔ صدیوں سے یہ ورثہ ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور قومی شناخت کا ایک اہم ستون رہا ہے۔

تاہم افسوسناک امر یہ ہے کہ ایک مخصوص شدت پسند طبقے کی جانب سے قوم مسلم کے خلاف تعصب، نفرت اور اشتعال انگیزی پر مبنی سرگرمیوں کا سلسلہ مسلسل جاری ہے، ادھر چند سالوں سے مسلم مخالف سرگرمیاں انتہا پر ہیں۔ کہیں ہجوم کے تشدد (Mob Lynching) کے واقعات رونما ہوتے ہیں، کہیں داڑھی، حجاب یا برقعے کو نشانہ بنا کر ہراسانی کی جاتی ہے، کہیں مخصوص نعرے لگانے پر مجبور کیا جاتا ہے اور انکار کی صورت میں تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ان تمام حالات کے تناظر میں سب سے زیادہ تشویش ناک امر یہ ہے کہ حالیہ دنوں میں ملک کے مختلف حصوں میں مساجد، مقابر، دینی درسگاہوں اور دیگر عبادت گاہوں کے خلاف انہدامی کارروائیوں کا سلسلہ تسلسل کے ساتھ سامنے آرہا ہے۔ صرف ایک ماہ کے مختصر عرصے میں دو درجن سے زائد مسلم عبادت گاہوں کے انہدام کے واقعات منظرِ عام پر آئے ہیں۔ ان میں سے

متعدد کارروائیاں ایسی بھی تھیں جن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا کہ نہ متعلقہ فریقین کو پیشگی اطلاع دی گئی اور نہ ہی مناسب نوٹس جاری کیے گئے، بلکہ بعض مقامات پر راتوں رات انہدامی اقدامات عمل میں لائے گئے۔ ایسے واقعات نہ صرف اضطراب اور بے چینی کو جنم دیتے ہیں بلکہ معاشرتی ہم آہنگی، قومی یکجہتی اور باہمی اعتماد کے لیے بھی نقصان دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس معاملے میں رونما ہونے والی تیز رفتار پیش رفت نے بین الاقوامی سطح پر بھی توجہ حاصل کی ہے، اور مختلف عالمی حلقوں میں اس پر اظہارِ تشویش دیکھنے میں آرہا ہے۔ واشنگٹن (امریکہ) میں قائم انسانی حقوق کی تنظیم "Justice For All" کی جانب سے 17 جون 2026 کو ایک پریس ریلیز جاری کی گئی۔ اس پریس ریلیز میں سنبھل، وارانسی اور جے پور میں مساجد کی شہادت پر تشویش کا اظہار کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کا آغاز ان الفاظ میں ہے:

Justice For All is alarmed at the acceleration of mosque demolitions in India. Over a 5 day period, three mosques have been demolished under various pretenses. These demolitions include two mosques in the northern state of Uttar Pradesh, viz. Masjid Mustafa Qadri in Sambhal and the Shaheed Azgaib Mosque in Varanasi, and the Noorani Mosque in Jaipur, Rajasthan.

واشنگٹن میں قائم تنظیم "Justice For All" نے بھارت میں مساجد کی مسماری میں تیزی پر شدید تشویش کا اظہار کیا ہے۔ تنظیم کے مطابق صرف پانچ دن کے عرصے میں مختلف جواز پیش کرتے ہوئے تین مساجد کو منہدم کیا گیا۔ ان میں ریاست اتر پردیش کے ضلع سنبھل کی مسجد مصطفیٰ قادری، وارانسی کی شہید ازغیب مسجد اور راجستھان کے شہر جے پور کی نورانی مسجد شامل ہیں۔

مختلف حیلوں بہانوں کو بنیاد بنا کر ملک بھر میں مساجد کے انہدام کا سلسلہ تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ ہر روز اس نوعیت کی خبریں اخبارات کے صفحات کو سیاہ کرتی نظر آتی ہیں، جنھیں پڑھ کر ہر صاحب ایمان دل رنج والم سے تڑپ اٹھتا ہے۔ صرف ایک ماہ کے مختصر عرصے میں متعدد مساجد کے انہدام کے واقعات پیش آئے ہیں، جن کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے۔

مسجد چوک، فرید آباد (ہریانہ) کی مسجد کا انہدام

29 مئی 2026 کو ہریانہ کے شہر فرید آباد کے مسجد چوک میں واقع ایک قدیم مسجد کو فرید آباد میونسپل کارپوریشن نے تجاوزات کے خلاف جاری وسیع آپریشن کے دوران منہدم کر دیا۔

تقریباً پچاس برس قبل تعمیر ہونے والی یہ مسجد، جو این آئی ٹی 3 کے علاقے میں واقع تھی، قریب سات سو مربع گز رقبے پر مشتمل تھی۔ انتظامیہ کے مطابق گڑ گاؤں فرید آباد نوئیڈا ریجنل ریپڈ ٹرانزٹ سسٹم (RRTS) کوریڈور اور مجوزہ ایلیویٹڈ روڈ کی تعمیر کے لیے اس مقام کو خالی کرانا ناگزیر تھا۔

سرکاری حکام کا موقف تھا کہ یہ کارروائی سپریم کورٹ کی ہدایات اور نیشنل گرین ٹریبونل (NGT) کے ان احکامات کی روشنی میں عمل میں لائی گئی جن کا تعلق گرین بیلٹ کی اراضی پر قائم تجاوزات کے خاتمے سے تھا۔ دوسری جانب مقامی رہائشیوں نے دعویٰ کیا کہ انہیں اس انہدامی کارروائی سے قبل مناسب پیشگی اطلاع فراہم نہیں کی گئی۔

ممبئی کے باندرہ ایسٹ میں دو مساجد کا انہدام

30 مئی 2026 کو ممبئی کے باندرہ علاقے میں تجاوزات کے خلاف جاری مہم کے دوران دو مساجد کو منہدم کر دیا گیا۔

از غیب شہید مسجد، وارانسی

وارانسی کے کاشی ریلوے اسٹیشن کے احاطے میں راج گھاٹ کے قریب واقع از غیب شہید مسجد تقریباً دو سو سال قدیم تاریخی مسجد تھی۔ 2 جون 2026 کی شب سرکاری حکام نے بھاری پولیس نفری کی موجودگی میں اس مسجد کو شہید کر دیا۔

انتظامیہ کا موقف تھا کہ مسجد ریلوے کی اراضی پر قائم تھی، جسے کاشی ماڈل ریلوے اسٹیشن کی تعمیرِ نو کے منصوبے کے لیے مختص کیا جا چکا ہے۔ حکام کے مطابق یہ کارروائی عدالتی کارروائی مکمل ہونے اور مسجد کمیٹی کو متعدد نوٹس جاری کیے جانے کے بعد عمل میں لائی گئی۔

مسجد مصطفیٰ قادری، سنبھل

سنبھل کی معروف مسجد مصطفیٰ قادری کو بھی 6 جون 2026 کو شہید کر دیا گیا۔ طرفہ تماشہ یہ کہ پولیس نے مسجد کے متولی سمیت آٹھ افراد کے خلاف یہ کہہ کر مقدمہ بھی درج کیا کہ مسجد کے اندر سے "I Love Muhammad" کے نعرے والے پوسٹرز اور ایک سبز پرچم برآمد ہوا۔ حکام کا موقف تھا کہ مسجد قبرستان کی زمین پر غیر قانونی طور پر تعمیر کی گئی تھی اور اس کا انہدام قانونی کارروائی مکمل ہونے کے بعد کیا گیا۔

سنبھل عید گاہ

10 جون 2026 کو اتر پردیش کے ضلع سنبھل میں واقع ایک عید گاہ کے خلاف بھی انہدامی کارروائی عمل میں لائی گئی۔

محکمۂ مال اور مقامی انتظامیہ نے دولت پور خان کے علاقے میں واقع عید گاہ کی احاطہ دیوار کو منہدم کر دیا، جبکہ وہاں موجود ایک کمرے کو بھی ہٹانے کا عمل شروع کر دیا گیا۔

یہ کارروائی سب ڈویژنل مجسٹریٹ وکاس چندر کی نگرانی میں انجام دی گئی، جس کے لیے بلدیہ کی کرین اور بلڈوزر کے ساتھ بھاری پولیس نفری بھی تعینات کی گئی تھی۔ انتظامیہ کے مطابق زمینی سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ مذکورہ تعمیرات پلاٹ نمبر 432 پر واقع عوامی راستے پر تجاوزات کے زمرے میں آتی ہیں۔

احاطہ دیوار منہدم کیے جانے کے بعد متعلقہ افراد کو متصل کمرہ خالی کرنے کے لیے مختصر مہلت دی گئی، تاکہ وہ اپنی مدد سے باقی ماندہ ڈھانچہ ہٹا کر تعمیراتی سامان محفوظ مقام پر منتقل کر سکیں۔

نورانی مسجد، جے پور

8 جون 2026 کو راجستھان کے دارالحکومت جے پور میں واقع نورانی مسجد بھی شہید کر دی گئی۔ جے پور ڈیولپمنٹ اتھارٹی (JDA) نے مالویہ نگر اور جگت پورہ کو ملانے والے سڑک کی توسیعی منصوبے کے تحت اس مسجد کو منہدم کر دیا۔ کارروائی سے قبل تقریباً 3,000 پولیس اہلکار تعینات کیے گئے، متعدد علاقوں میں موبائل انٹرنیٹ خدمات معطل کر دی گئیں اور امن و امان برقرار رکھنے کے لیے اجتماعات پر پابندیاں عائد کی گئیں۔

حکام کا کہنا تھا کہ مسجد سڑک کی حدود میں واقع تھی، اس لیے دیگر مذہبی ڈھانچوں کے ساتھ اسے بھی ہٹانا ضروری تھا۔ تاہم راجستھان وقف بورڈ اور کئی سماجی رہنماؤں نے موقف اختیار کیا کہ مسجد ایک رجسٹرڈ وقف جائیداد تھی اور اس کے باوجود، جب کہ قانونی کارروائی زیرِ سماعت تھی، اسے منہدم کر دیا گیا۔

نوری مسجد، بھائندر (مہاراشٹر)

مہاراشٹر کے شہر بھائندر ایسٹ کے آزاد نگر / گولڈ نیسٹ سرکل میں واقع نوری مسجد کو 8 جون 2026 کی صبح سویرے میرا بھائندر میونسپل کارپوریشن (MBMC) نے بھاری پولیس نفری کی موجودگی میں منہدم کر دیا۔

حکام کے مطابق مسجد میونسپل کارپوریشن کے محفوظ شدہ پلاٹ نمبر 122 پر تعمیر کی گئی تھی، جو عوامی بنیادی ڈھانچے، بشمول مجوزہ بالا صاحب ٹھاکرے آرٹ ہال، کے لیے مختص تھا۔

باڑمیر (راجستھان) میں چار مساجد کا انہدام

18 جون 2026 کو راجستھان کے ضلع باڑمیر کے ملانہ گاؤں میں مقامی حکام نے چار مساجد کو منہدم کر دیا۔ اطلاعات کے مطابق 17 جون کو نوٹس جاری کیے گئے تھے اور اگلے ہی روز انہدامی کارروائی انجام دی گئی، جبکہ قانونی کارروائی ابھی جاری تھی۔ حکام کا کہنا تھا کہ یہ مساجد نجی زرعی زمین پر تعمیر کی گئی تھیں، جسے قانونی طور پر اس مقصد کے لیے تبدیل نہیں کیا گیا تھا۔ علاقے کی تقریباً بارہ مساجد کو نوٹس جاری کیے جانے کے باعث مقامی مسلم آبادی میں خوف اور تشویش کی فضا پیدا ہو گئی۔

جوناکنڈلا مسجد گجرات کا انہدام

29 جون 2026 کو گجرات کی معروف مسجد جوناکنڈلا مسجد پر بلڈوزر چلا کر شہید کر دیا گیا۔ یہ مسجد 1965ء سے سرکاری وقف ریکارڈ میں درج ہے۔ مسجد کے صدر محمد سمار کے مطابق یہ انہدامی کاروائی انتظامیہ کی طرف سے نوٹس دیے بغیر عمل میں آئی۔ انتظامیہ کا موقف سیکورٹی اور تجاوزات کے خلاف کاروائی کا ہے۔

یہ تو محض چند مساجد اور مذہبی مقامات کے خلاف ہونے والی کارروائیوں کا تذکرہ ہے جو گزشتہ تیس چالیس دنوں میں انجام دیے گئے، ورنہ ملک کے طول و عرض میں انہدامی مہم ایک تشویش ناک اور وسیع صورت اختیار کیے ہوئے ہے۔ مختلف ریاستوں سے مسلسل ایسی خبریں موصول ہو رہی ہیں کہ کہیں تجاوزات کے نام پر، کہیں سرکاری زمین کا بہانہ بنا کر اور کہیں دیگر انتظامی وجوہات کا سہارا لے کر مساجد اور دیگر مسلم مذہبی مقامات کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

میڈیا رپورٹس کے مطابق صرف راجستھان کی تقریباً 1070 کلو میٹر طویل سرحدی پٹی کے چار اضلاع میں واقع لگ بھگ 350 مساجد کو نوٹس جاری کیے جا چکے ہیں۔ اس سے اس کارروائی کی وسعت اور سنگینی کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

تشویش ناک امر یہ بھی ہے کہ جن بنیادوں پر مساجد کے خلاف کارروائیاں کی جا رہی ہیں، انہی نوعیت کی دیگر تعمیرات کو بظاہر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس حوالے سے کانگریس کے سینئر رہنما اور رکنِ اسمبلی ہریش چودھری کا یہ بیان خاص توجہ کا قابل ہے: "جس زمین پر مسجد موجود تھی، اسی نوعیت کی دیگر تعمیرات بھی وہاں موجود ہیں، مگر کارروائی صرف مسجد کے خلاف کی گئی۔"

مزید برآں، بعض مقامات سے یہ اطلاعات بھی سامنے آئی ہیں کہ جہاں انتظامیہ کی جانب سے پیش کیا گیا ابتدائی جواز حقائق کے سامنے آنے پر کمزور ثابت ہوا، وہاں مبینہ طور پر اعتراض کی بنیاد تبدیل کر کے انہدامی کارروائی کو برقرار رکھنے کی کوشش کی گئی۔ اسی تناظر میں 21 جون 2026 کو رکنِ پارلیمنٹ اسد الدین اویسی نے مرکزی وزیرِ داخلہ امت شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے ایک ٹویٹ کیا، جس میں انہوں نے ان کارروائیوں پر شدید تشویش کا اظہار کرتے ہوئے انہیں امتیازی اور غیر قانونی قرار دیا اور فوری طور پر روکنے کا مطالبہ کیا۔ اویسی اپنے ٹویٹ میں لکھتے ہیں:

There has been a wave of demolitions targeting mosques, dargahs, and other Muslim religious sites across Rajasthan’s border districts of Bikaner, Phalodi, Jaisalmer, and Barmer. Authorities have alleged that some structures are built on grazing land. In cases where it has been shown that the structures stand on private property, the allegation has reportedly shifted to a lack of permissions or approvals.

"راجستھان کے سرحدی اضلاع بیکانیر، پھلودی، جیسلمیر اور باڑمیر میں مساجد، درگاہوں اور دیگر مسلم مذہبی مقامات کے انہدام کی ایک منظم لہر جاری ہے۔ حکام کا دعویٰ ہے کہ بعض عمارتیں چراگاہ کی زمین پر تعمیر کی گئی ہیں، لیکن جہاں یہ ثابت کیا گیا کہ متعلقہ عمارتیں نجی ملکیت کی زمین پر قائم ہیں، وہاں مبینہ طور پر اعتراض کی بنیاد تبدیل کر کے تعمیراتی اجازت یا منظوری نہ ہونے کا جواز پیش کیا جانے لگا۔"

ایسے حالات میں یہ سوال فطری طور پر ذہن میں ابھرتا ہے کہ اگر تجاوزات کے خلاف کارروائی قانون کے مطابق کی جارہی ہے تو پھر اس کا رخ تقریباً یک طرفہ طور پر مسلمانوں کی عبادت گاہوں ہی کی جانب کیوں ہے؟ مزید یہ کہ جہاں متعلقہ افراد حکام کے دعووں کے برخلاف یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ متعلقہ تعمیرات نجی ملکیت یا قانونی بنیاد پر قائم ہیں، وہاں اعتراض کی نوعیت بدل کر کبھی اجازت نامے اور کبھی دیگر انتظامی تقاضوں کو بنیاد بنا کر انہدام کا جواز پیش کرنا آخر کس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے؟ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جس قوم کی مساجد، مدارس، خانقاہیں اور دیگر دینی مراکز مسلسل انہدامی کارروائیوں کی زد میں ہیں، وہ ابھی تک مجموعی طور پر کوئی سنجیدہ، منظم اور مؤثر قانونی حکمتِ عملی اختیار نہیں کر سکی۔

حادثے سے بڑا سانحہ یہ ہوا
لوگ ٹھہرے نہیں، حادثہ دیکھ کر

یہ ضرور ہے کہ جہاں جہاں یہ آزمائش آئی ہے، وہاں کے ذمہ داران اپنی استطاعت کے مطابق قانونی چارہ جوئی کر رہے ہیں، لیکن یہ کوششیں زیادہ تر انفرادی نوعیت کی ہوتی ہیں، جو محدود وسائل، مسلسل دباؤ یا طویل قانونی مراحل کے باعث رفتہ رفتہ کمزور پڑ جاتی ہیں۔ نتیجتاً ہر نئے سانحے پر ہم صرف افسوس اور ماتم کرنے کے سوا کچھ نہیں کر پاتے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مضبوط، منظم اور اجتماعی قوت سے کی جانے والی جدوجہد ہی دیرپا نتائج پیدا کرتی ہے۔ اگر ابتدا ہی سے اہلِ علم، وکلا، سماجی کارکن، دینی ادارے اور صاحبِ حیثیت افراد ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع ہو کر قانونی، مالی اور اخلاقی تعاون فراہم کریں تو نہ صرف مقدمات زیادہ مضبوط انداز میں لڑے جا سکتے ہیں بلکہ قومی سطح پر بھی ان مسائل کی جانب مؤثر توجہ مبذول کرائی جا سکتی ہے۔ ایسی منظم کوشش انتظامیہ کو بھی آئینی حدود کے اندر رہ کر جواب دہ بنانے کا ذریعہ بنے گی، اور وہ کارروائیاں جو چند ہی دنوں میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دی جاتی ہیں، قانونی مزاحمت کے نتیجے میں طویل عرصے تک زیرِ سماعت رہ سکتی ہیں۔ اس کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوگا کہ انہدام کی اس تیز رفتار مہم کی شدت میں نمایاں کمی آئے گی۔

کاش! ہم حالات کی سنگینی کو بروقت محسوس کریں، متحد و منظم ہو کر آگے بڑھیں اور شعور، صبر، حکمت اور مسلسل قانونی جدوجہد کے ذریعے اپنے آئینی و مذہبی حقوق کا تحفظ کریں۔



درس قرآن

گناہوں سے نفرت

از: مولانا محمد حبیب اللہ بیگ ازہری، جامعہ اشرفیہ مبارک پور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اللہ رب العزت سورۂ یوسف کی آیت نمبر: 23-24 میں ارشاد فرماتا ہے:

وَ رَاوَدَتۡہُ الَّتِیۡ ہُوَ فِیۡ بَیۡتِہَا عَنۡ نَّفۡسِہٖ وَ غَلَّقَتِ الۡاَبۡوَابَ وَ قَالَتۡ ہَیۡتَ لَکَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰہِ اِنَّہٗ رَبِّیۡۤ اَحۡسَنَ مَثۡوَایَ ؕ اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۳﴾ وَ لَقَدۡ ہَمَّتۡ بِہٖ ۚ وَ ہَمَّ بِہَا لَوۡ لَاۤ اَنۡ رَّاٰ بُرۡہَانَ رَبِّہٖ ؕ کَذٰلِکَ لِنَصۡرِفَ عَنۡہُ السُّوۡٓءَ وَ الۡفَحۡشَآءَ ؕ اِنَّہٗ مِنۡ عِبَادِنَا الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۲۴﴾ [سورۂ یوسف: 2423]

یوسف جس گھر میں تھے اس گھر کی عورت نے یوسف کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا، اور دروازے بند کر کے کہا کہ آجاؤ، یوسف نے کہا: اللہ کی پناہ، میرے مالک نے مجھے اچھی طرح رکھا، بے شک ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔ اس عورت نے ارادہ کر لیا، اور اگر یوسف اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو وہ بھی ارادہ کر لیتے، ہم اسی طرح اس سے برائی اور بے حیائی کو پھیر دیتے ہیں، بے شک وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے۔

ان آیاتِ مبارکہ میں حضرت یوسف علیہ الصلاۃ والسلام کے طویل ترین قصے کے ایک اہم گوشے کو بیان کیا گیا ہے، ہم اس کی قدرے تفصیل کریں گے، پھر اس سے حاصل ہونے والے فوائد بیان کریں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام بڑے جلیل القدر پیغمبر ہیں، اور ایک ایسے پیغمبر ہیں جو خود بھی نبی ہیں، جن کے والد بھی نبی ہیں، دادا بھی نبی ہیں اور پر دادا بھی نبی ہیں، آپ بڑے خوب صورت اور نیک سیرت تھے۔ اللہ رب العزت نے آپ کو ایسا حسین و جمیل بنایا تھا کہ جب زنانِ مصر نے آپ کو دیکھا تو انگلیاں کاٹ لیں، لیکن انھیں احساس تک نہیں ہوا، اور سب نے بیک زبان کہا:

"مَا ہٰذَا بَشَرًا ؕ اِنۡ ہٰذَاۤ اِلَّا مَلَکٌ کَرِیۡمٌ" [سورۂ یوسف: 31]

یہ بشر نہیں ہو سکتا، یہ تو معزز فرشتہ ہے۔

بچپن ہی سے آپ کی پیشانی پر نورِ نبوت روشن تھا، آپ کے اخلاق و آداب بھی خوب تھے، اسی لیے آپ کے والد گرامی حضرت یعقوب علیہ السلام آپ کو سب سے زیادہ محبوب رکھتے تھے، لیکن آپ کی یہ محبوبیت آپ کے بھائیوں کو راس نہیں آئی، تو انھوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے دل سے آپ کی محبت ختم کرنے کے لیے ایک سازش رچی، ایک دن آپ کو گھمانے کے بہانے بن میں لے گئے، اور حضرت یوسف علیہ السلام کو کھاری کنویں میں پھینک دیا۔ بعض نامعلوم راہ گیروں نے آپ کو کنویں سے نکالا، اور بازارِ مصر میں فروخت کر دیا۔ بازارِ مصر سے عزیزِ مصر نے آپ کو مہنگے دام پر خریدا، اور شاہی اعزاز کے ساتھ اپنے محل میں رکھا۔ جب آپ عنفوانِ شباب میں پہنچے تو عزیزِ مصر کی زوجہ آپ پر فریفتہ ہو گئی، ایک دن آپ کو تنہائی میں بلایا، محل کے سارے دروازے بند کر دیے، آپ کو اپنی طرف راغب کیا، اور کہا کہ میرے قریب ہو جاؤ، تو آپ نے فرمایا: اللہ کی پناہ، میں اپنے محسن عزیزِ مصر کے ساتھ خیانت نہیں کر سکتا، بے شک ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔

واضح رہے کہ انبیائے کرام قبلِ نبوت اور بعدِ نبوت ارتکابِ کبائر اور تعمدِ صغائر سے پاک ہوتے ہیں، اسی لیے ان سے گناہ کا تصور بھی محال ہے، لیکن آپ جس سے ہم کلام تھے وہ آپ کی پیغمبرانہ شان سے ناواقف تھی، اسی لیے اس نے آپ کو اپنی طرف راغب کرنا چاہا۔ اس سلسلے میں قرآنِ کریم نے جو تفصیل بیان کی اس کے مطابق عزیزِ مصر کی زوجہ کی طرف سے تین کوششیں ہوئیں، جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی تین باتیں کہیں۔

اس عورت کا پہلا عمل تھا: رَاوَدَتْهُ۔ اس نے لبھایا، اور گناہ پر آمادہ کیا۔

دوسرا عمل تھا: غَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ۔ یعنی خواہشِ نفس کی تکمیل کے لیے جس تنہائی کی ضرورت تھی اس کا مکمل بندوبست کر لیا۔

تیسرا عمل تھا: قَالَتْ هَيْتَ لَكَ۔ محض ترغیب یا محفوظ گوشے کے انتظام پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ زبان کھول کر کہا کہ قریب آجاؤ۔

ان سب کوششوں کا ظاہری تقاضا یہ تھا کہ گناہ کا دروازہ کھل جاتا، اور شیطانی تدبیر کامیاب ہو جاتی، لیکن اللہ رب العزت کی نصرت وحمایت اور حضرت یوسف علیہ السلام کی عفت و کرامت کا کمال تھا کہ شیطان خائب و خاسر ہوا، گناہ کی تدبیر ناکام ہوئی، اور صبحِ قیامت تک آنے والے انسانوں کو یہ درسِ عزیمت ملا کہ بندہ اگر گناہ سے بچنا چاہے تو اللہ رب العزت رات کی تاریکی میں اور بند کمروں میں بھی اسے گناہ سے بچالیتا ہے، اسی لیے بندے کو چاہیے کہ ہمیشہ اندر گناہ سے بچنے کا جذبہ فراواں رکھے، اور اس سلسلے میں اللہ کی طرف رجوع کرتا رہے۔

پیشِ نظر واقعہ میں دیکھیں کہ جب زلیخا نے عملی، حفاظتی اور زبانی کوشش کر لی تو حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی تین جوابات دیے۔

آپ کا پہلا جواب تھا: مَعَاذَ اللّٰہِ۔ اللہ کی پناہ۔ یعنی جب اس عورت نے لبھایا تو کہا کہ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں، اور کسی بھی مومن بندے کے لیے روا نہیں کہ وہ مخلوق کی طاعت میں خالق کی نافرمانی کرے، اسی لیے میں اللہ کی نافرمانی کر کے اسے ناراض نہیں کر سکتا۔

آپ کا دوسرا جواب تھا: اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ۔ یعنی جب اس عورت نے دروازے بند کر کے تنہائی کا ماحول بنا دیا تو آپ نے فرمایا کہ میرے مالک نے میرے ساتھ بڑی خیر خواہی کی ہے، اور میرا بھرپور خیال رکھا ہے، جس نے میرے ساتھ اتنی ہم دردی کی ہو اس کے ساتھ میری وفاداری کا تقاضا یہی ہے کہ میں اسے اذیت نہ دوں، اور جس طرح اس کے سامنے وفا شعار بن کر رہتا ہوں ویسے ہی پیٹھ پیچھے بھی رہوں، اور اس کی عدم موجودگی میں اس کے اہل کے ساتھ خیانت کر کے اسے تکلیف نہ پہنچاؤں۔

آپ کا تیسرا جواب تھا: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۔ بے شک ظالم کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی جب اس عورت نے کہا کہ قریب آجاؤ تو آپ نے فرمایا کہ میں اپنی عزت و کرامت کو پامال کر کے اپنے اوپر ظلم نہیں کر سکتا، کیوں کہ کوئی بھی ظالم کامیاب نہیں ہوتا۔

حضرت یوسف علیہ السلام نے جس وقت یہ جوابات عطا فرمائے وہ بڑا ہی نازک وقت تھا، قرآنِ کریم کے مطابق اس خاتون کا جو حال تھا وہ یہ تھا کہ: وَ لَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ۔ یعنی اس نے گناہ کا عزمِ مصمم کر لیا تھا، قرآن نے اس عزم کو تاکیدی انداز میں بیان کیا کہ وہ عورت پورے طور پر آمادہ ہو چکی تھی، جس کا فوری اور لازمی اثر یہ ہوا کہ لگتا تھا کہ دوسرا فریق بھی تیار ہو جائے گا، لیکن تائید الٰہی اور نصرتِ غیبی نے بچا لیا، یہ سب من جانبِ اللہ تھا، لیکن اس کا ایک ظاہری سبب بھی تھا، وہ یہ کہ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ۔ وہ بڑا مخلص بندہ تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جب بندہ اپنے ایمان و عمل میں مخلص ہوتا ہے تو ہر حال میں اپنے رب کو حاضر و ناظر جانتا ہے، اور سفر و حضر، صحت و مرض، فقر و غنا، خلوت و جلوت میں گناہ سے بچنے کی کوشش کرتا ہے، کیوں کہ اسے اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ اس کا رب اسے ہر حال میں دیکھ رہا ہے۔

واضح رہے کہ گناہ کرنے والے افراد دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کے پاس گناہ کے اسباب نہیں ہوتے، اسی لیے وہ پورے شد و مد کے ساتھ گناہ نہیں کر سکتے۔ دوسرے وہ جن کے پاس گناہ کے اسباب ہوتے ہیں، اسی لیے وہ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اور پورے شد و مد کے ساتھ کرتے ہیں۔ اسی طرح گناہ سے بچنے والے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں: ایک وہ جن کے لیے گناہ کے دروازے بند ہوتے ہیں تو وہ بآسانی گناہ سے بچ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ جن کے پاس سوائے گناہ کے کوئی چارہ کار نہیں ہوتا، تو ان کے لیے گناہ سے بچنا دشوار ہوتا ہے۔

پیشِ نظر واقعہ پر غور کریں کہ خاتون کے پاس گناہ کے اسباب موجود تھے اسی لیے اس نے پورے زور و شور سے دعوت دی، جب کہ اس کے بالمقابل حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے بچ نکلنے کے راستے مسدود تھے، پھر بھی آپ سلامت باکرامت رہے، یہ آپ کی عفت و پاک دامنی، اللہ کی رضا جوئی، گناہ سے بیزاری، اور آزمائش میں ثابت قدمی کی ایک قابلِ تقلید مثال ہے۔

گناہ پر قدرت کے باوجود گناہ سے بچنا بہت عظیم عبادت ہے، احادیثِ مبارکہ میں اس کی بڑی فضیلت آئی ہے۔ چناں چہ صحیح بخاری شریف میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ قیامت کے دن سات افراد عرشِ الٰہی کے سائے میں ہوں گے، ان میں ایک شخص وہ بھی ہوگا جسے کسی خوب صورت اور صاحبِ منصب عورت نے گناہ کی دعوت دی تو اس نے یہ کہہ کر اس کی پیش کش ٹھکرا دی کہ میں اللہ رب العزت سے ڈرتا ہوں۔

اسی طرح صحیح بخاری شریف میں حضرت عبد اللہ ابنِ عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ قدیم زمانے میں تین افراد سفر پر نکلے، راستے میں سخت بارش ہوئی، تو وہ ایک غار میں روپوش ہو گئے، تھوڑی دیر بعد چٹان پھسلی، اور غار کا منھ بند ہو گیا، سب نے اپنے اپنے عمل کا وسیلہ دے کر اللہ کی بارگاہ میں دعا کی، جس سے چٹان کا منھ کھل گیا، وہ صحیح و سالم باہر نکل آئے، لیکن ان تینوں میں ایک بندہ وہ بھی تھا جس نے یہ دعا کی کہ اے اللہ! میری ایک چچازاد بہن تھی، جس سے میں بے پناہ محبت کرتا تھا، ایک دن وہ میرے پاس کچھ پیسوں کے لیے آئی تو میں نے کہا کہ تم مجھے خلوت کا موقع دو تو میں تمھیں تمھاری مطلوبہ رقم دے دوں گا، اس نے چار و ناچار میری بات مان لی، لیکن میں جب اس کے قریب گیا تو اس نے کہا کہ اللہ سے ڈرو، اور اس کی کسی باندی کی حرمت پامال نہ کرو، تو اے اللہ! میں نے تیری رضا کے لیے گناہ کا ارادہ ترک کر دیا، اور اس سے پیسے بھی نہیں لیے، اے اللہ! اگر میں نے تیری خشیت کی وجہ سے ایسا کیا ہے تو چٹان ہٹا دے، تو اللہ نے دعا سن لی، اور چٹان ہٹا دی۔

ان دونوں روایات سے معلوم ہوا کہ گناہ پر قدرت کے باوجود گناہ سے دور و نفور رہنا ایک ایسا عمل ہے جس سے دنیا میں بلائیں ٹلتی ہیں، اور دعائیں قبول ہوتی ہیں، اور جو بندہ باوجودِ قدرت کے گناہ سے اجتناب کرتا ہے وہ قیامت کے دن عرشِ الٰہی کے سائے میں رہے گا، اسی لیے ضروری ہے کہ ہر حال میں گناہ سے اجتناب کریں، اور اس سلسلے میں اللہ کی طرف رجوع کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆



راستوں کا حق

از: حضرت علامہ عبدالمصطفی اعظمی صاحب رحمہ اللہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عَنۡ اَبِیۡ سَعِیۡدِنِ الۡخُدۡرِیِّ اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ قَالَ: اِیَّاکُمۡ وَالۡجُلُوۡسَ بِالطُّرُقَاتِ فَقَالُوۡا: یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ مَا لَنَا مِنۡ مَّجَالِسِنَا بُدٌّ نَتَحَدَّثُ فِیۡھَا فَقَالَ: فَاِذَا اَبَیۡتُمۡ اِلَّا الۡمَجۡلِسَ فَاَعۡطُوۡا الطَّرِیۡقَ حَقَّہٗ قَالُوۡا: وَمَا حَقُّ الطَّرِیۡقِ یَا رَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ: غَضُّ الۡبَصَرِ وَکَفُّ الۡاَذٰی وَرَدُّ السَّلَامِ وَالۡاَمۡرُ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَالنَّھۡیُ عَنِ الۡمُنۡکَرِ (بخاری، کتاب الاستیذان، ص۹۲۰)

ترجمہ: حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ راستوں پر بیٹھنے سے بچو، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے کہا کہ یارسول اللہ! عزوجل و صلی اللہ علیہ وسلم راستوں میں بیٹھنے سے تو ہم لوگوں کو چارہ ہی نہیں ہے کیونکہ ان ہی جگھوں میں تو ہم لوگ بیٹھ کر بات چیت کرتے ہیں، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر تم لوگ راستوں میں بیٹھنے سے باز نہیں رہ سکتے تو بیٹھو لیکن راستے کا حق دیتے رہو۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! عزوجل و صلی اللہ علیہ وسلم راستہ کا کیا حق ہے؟ تو ارشاد فرمایا کہ (۱) نیچی نگاہ رکھنا (۲) کسی کو ایذا نہ دینا (۳) لوگوں کے سلام کا جواب دینا (۴) اچھی باتوں کا حکم دینا (۵) بُری باتوں سے منع کرنا۔

فوائد: (۱) علامہ قَسطلانی نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم کہ "تم لوگ راستوں پر بیٹھنے سے بچو" یہ حکم وجوبی نہیں تھا بلکہ اِستحبابی تھا کیونکہ اگر یہ حکم وجوبی ہوتا تو صحابہ اس کے جواب میں ہرگز ہرگز کبھی یہ نہ کہتے کہ ہمارے لیے تو راستوں پر بیٹھنے سے چارہ ہی نہیں ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ فرماتے کہ اچھا تم لوگ بیٹھو تو راستوں کا حق دیتے رہو۔

(۲) مذکورہ بالا پانچوں باتوں کو حضور ﷺ نے راستہ کا حق قرار دیا ہے اور مومن پر ازروئے شریعت ہر حق والے کا حق ادا کرنا واجب ہے لہٰذا جو لوگ راستوں پر بیٹھیں ان پر واجب ہے کہ ان پانچوں باتوں پر عمل کریں۔

(۳) بلا ضرورت راستوں پر بیٹھنا اگرچہ راستہ کے حقوق ادا کرنے کی صورت میں حرام اور گناہ تو نہیں مگر چونکہ یہ کوئی اچھی خصلت بھی نہیں ہے لہٰذا حتی الوسع مسلمانوں کو اس سے پرہیز ہی کرنا چاہیے۔ خصوصاً اس زمانے میں جبکہ بے پردگی بلکہ عریانی و برہنگی فیشن بن چکی ہے سڑکوں اور راستوں پر لوگوں کا بیٹھنا بہت سے مفاسد کا پیش خیمہ ہے لہٰذا اس سے خاص طور پر پرہیز کرنا چاہیے۔

(۴) راستوں کے پانچوں حقوق کی قدرے تفصیل یہ ہے:

اوّل: نگاہوں کو نیچی رکھنا، چونکہ راستوں پر عورتیں اور مرد بھی گزریں گے اس لیے بیٹھنے والے پر ازروئے حکم شریعت واجب ہے کہ نہ غیر محرم عورتوں پر نظر ڈالیں نہ لوگوں کے ان عیوب کو دیکھیں جن کو راستہ چلنے والے لوگوں سے چھپانا چاہتے ہیں مثلاً کوڑھی یا سفید داغ والے یا لنگڑے لولے کو گھور گھور کر بار بار نہ دیکھیں کہ اس سے ان لوگوں کی دل آزاری ہو گی۔

دوم: کسی کو ایذا نہ دینا، یعنی اس طرح راستوں پر نہ بیٹھا کریں کہ راستہ تنگ ہو جائے اور گزرنے والوں کو ایذا پہنچے۔ یوں ہی راستہ چلنے والوں کا مذاق نہ اڑائیں، راستہ چلنے والوں کی تحقیر اور عیب جوئی نہ کریں، سفر کرنے والوں کی جاسوسی نہ کریں کہ کون کون، کہاں کہاں جاتا ہے اور کیوں جاتا ہے، غرض راستوں پر بیٹھنے والے اپنے کسی قول و فعل سے گزرنے والوں کو تکلیف اور ایذا نہ پہنچائیں۔

سوم: ہر گزرنے والے کے سلام کا جواب دیتے رہیں۔

چہارم: راستہ چلنے والوں کو اچھی باتیں بتاتے رہیں مثلًا آگے راستہ میں کوئی خطرہ ہو یا راستہ میں کوئی رکاوٹ ہو تو اس سے راستہ چلنے والوں کو آگاہ کرتے رہیں راستہ بھولنے والوں یا ناواقفوں کو راستہ بتاتے رہیں اور راستہ چلنے کے شرعی آداب لوگوں کو بتاتے اور سکھاتے رہیں۔

پنجم: خلافِ شریعت اور بری باتوں سے لوگوں کو منع کرتے رہیں تاکہ راستہ چلنے والے سفر میں کوئی خلافِ شریعت کام نہ کرنے پائیں۔

مخلوق خدا پر رحم کرنے کی فضیلت

از: سیدنا امام غزالی رضی اللہ عنہ

درس تصوف

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: جنت میں رحم کرنے والا ہی داخل ہو گا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: ہم سب رحم کرنے والے ہیں، آپ نے فرمایا: رحیم وہ نہیں جو اپنے آپ پر رحم کرے بلکہ رحیم وہ ہے جو اپنے آپ پر اور دوسروں پر رحم کرے۔

رحم کی حقیقت: اپنے آپ پر رحم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خلوصِ دل سے عبادت کر کے گناہوں سے کنارہ کش ہو کر اور توبہ کر کے اپنے وجود کو اللہ کے عذاب سے بچائے، دوسروں پر رحم یہ ہے کہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ دے۔

فرمانِ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم ہے: مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے لوگ محفوظ رہیں اور وہ جانوروں پر رحم کرے، ان سے ان کی طاقت کے مطابق کام لے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے: ایک شخص سفر میں جا رہا تھا کہ اسے راستہ میں سخت پیاس لگی، اسے قریب ہی ایک کنواں نظر آیا، جب کنوئیں سے پانی پی کر چلا تو دیکھا ایک کتا پیاس کے مارے زبان باہر نکالے پڑا ہے، اسے خیال آیا کہ اسے بھی میری طرح پیاس لگی ہو گی، وہ واپس گیا، منہ میں پانی بھر کر کتے کے پاس آیا اور اسے پلا دیا، اللہ تعالیٰ نے محض اسی رحم کی بدولت اس کے گناہوں کو معاف کر دیا۔

صحابہ کرام نے سوال کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! جانوروں پر شفقت کرنے سے بھی ہمیں ثواب ملتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہر ذی روح پر شفقت کا اجر ملتا ہے۔

حضرتِ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے: ایک رات حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ گشت لگا رہے تھے کہ آپ کا گزر ایک قافلہ سے ہوا، آپ کو اندیشہ لاحق ہوا کہیں کوئی ان کا سامان نہ چرا لے، راستے میں انہیں حضرتِ عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ملے اور انہوں نے پوچھا: امیر المؤمنین! اس وقت کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ایک قافلہ قریب اترا ہے، مجھے ڈر ہے کہیں کوئی چور اُن کا سامان نہ لیجائے، چلو ان کی نگہبانی کریں، یہ دونوں حضرات قافلہ کے قریب جا کر بیٹھ گئے اور ساری رات پہرہ دیتے رہے یہاں تک کہ صبح ہو گئی، حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ نے آواز دی اے قافلہ والو! نماز کے لیے اٹھو! جب قافلہ میں جاگ ہو گئی تو یہ حضرات واپس لوٹے۔

پس ہمارے لیے ضروری ہے کہ ہم صحابہ کرام کے نقشِ قدم پر چلیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف میں ارشاد فرمایا: "رُحَمَآءُ

بَيْنَهُمْ "وہ مسلمانوں پر بلکہ تمام مخلوق پر رحم کرنے والے ہیں یہاں تک کہ ذمی کافر بھی ان کی نگاہِ شفقت سے محروم نہ رہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے ذمی کو لوگوں کے دروازوں پر بھیک مانگتے ہوئے دیکھا تو فرمایا ہم نے تیرے ساتھ انصاف نہیں کیا، جوانی میں تجھ سے جزیہ لیتے رہے اور بڑھاپے میں تجھے دربدر ٹھوکریں کھانے کو چھوڑ دیا، آپ نے اسی وقت بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔

حضرتِ علی کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہ سے مروی ہے: میں نے ایک صبح حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھا ایک وادی میں اونٹ پر سوار چلے جارہے ہیں، میں نے پوچھا: امیر المؤمنین! کہاں جارہے ہیں؟ آپ نے فرمایا: صدقہ کے اونٹوں میں سے ایک اونٹ گم ہو گیا ہے۔ اسے تلاش کر رہا ہوں، میں نے کہا آپ نے بعد میں آنے والے خلفا کو مشکل میں ڈال دیا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جواب میں کہا: اے ابو الحسن! (رضی اللہ عنہ) مجھے ملامت نہ کرو، رب ذوالجلال کی قسم! جس نے محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو نبی برحق بنا کر بھیجا، اگر دریائے فرات کے کنارے ایک سالہ بھیڑ کا بچہ بھی مر جائے تو قیامت کے دن اس کے بارے میں مواخذہ ہوگا کیونکہ اس امیر کی کوئی عزت نہیں جس نے مسلمانوں کو ہلاک کر دیا اور نہ ہی اس بدبخت کا کوئی مقام ہے جس نے مسلمانوں کو خوف زدہ کیا۔

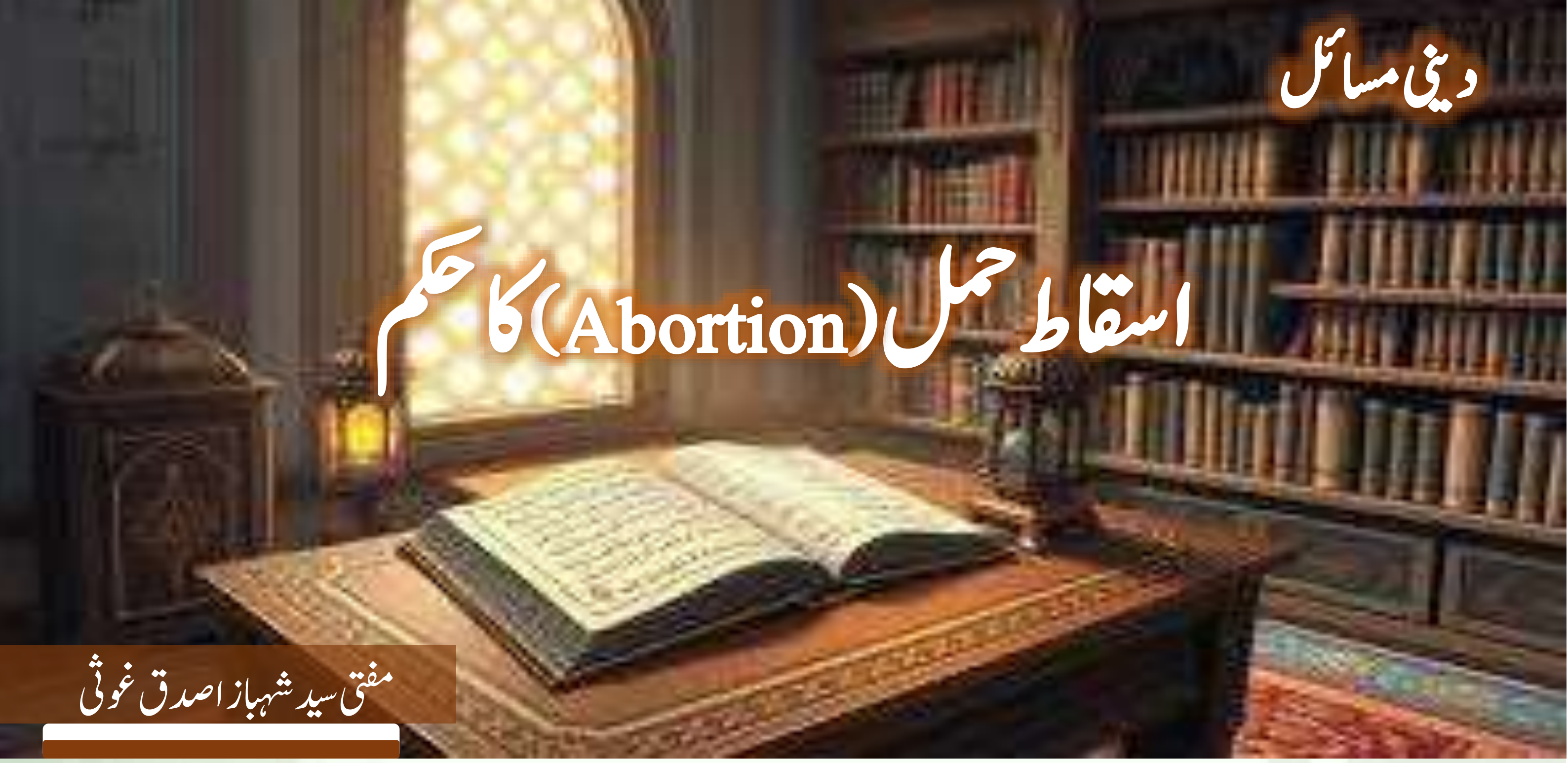
حکایت: بنی اسرائیل پر سخت قحط کا زمانہ تھا، ایک عابد کا ریت کے ٹیلے سے گزر ہوا تو اس کے دل میں خیال آیا کاش یہ ریت کا ٹیلہ آٹے کا ٹیلہ ہوتا اور میں اس سے بنی اسرائیل کے پیٹ بھرواتا، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے نبی کی طرف وحی بھیجی، میرے اس بندہ سے کہدو کہ تجھے اس ٹیلے کے برابر بنی اسرائیل کو آٹا کھلانے سے جتنا ثواب ملتا ہم نے تمہاری اس نیت کی بدولت ہی اتنا ثواب دے دیا ہے، اسی لیے فرمانِ نبوی ہے، مومن کی نیت اُس کے عمل سے بہتر ہے۔

حکایت: حضرتِ عیسیٰ علیہ السلام ایک مرتبہ کہیں جارہے تھے، آپ نے شیطان کو دیکھا ایک ہاتھ میں شہد اور دوسرے میں راکھ لیے چلا جارہا تھا، آپ نے پوچھا: اے دشمن خدا! یہ شہد اور راکھ تیرے کس کام آتی ہے؟ شیطان نے کہا: شہد غیبت کرنے والوں کے ہونٹوں پر لگاتا ہوں تاکہ وہ اور آگے بڑھیں، راکھ یتیموں کے چہروں پر ملتا ہوں تاکہ لوگ ان سے نفرت کریں۔

حضور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: جب یتیم کو دکھ دیا جاتا ہے تو اس کے رونے سے اللہ تعالیٰ کا عرش کانپ جاتا ہے، اور ربّ ذوالجلال فرماتا ہے: اے فرشتو! اس یتیم کو جس کا باپ منوں مٹی تلے دفن ہو چکا ہے، کس نے رلایا ہے؟

حضور انور صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کا ارشاد ہے کہ جس نے یتیم کے لباس و طعام کی ذمہ داری لے لی، اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جنت کو واجب کر دیا۔

"رَوْضَۃُ الْعُلَمَاء" میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کھانے سے پہلے میل دو میل کا چکر لگا کر مہمانوں کو تلاش کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ حضرت علی کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہ رو پڑے، پوچھا گیا: آپ کیوں روئے؟ آپ نے فرمایا: ایک ہفتہ ہو گیا، میرے ہاں کوئی مہمان نہیں آیا، شاید اللہ تعالیٰ مجھ سے خوش نہیں ہے۔ (احیاء العلوم ملخصًا)



اسقاط حمل (Abortion) کا حکم

مفتی سید شہباز اصدق غوثی

سوال: مفتی صاحب سے میرا سوال یہ ہے کہ اگر حمل ٹھہرنے کے بعد معلوم ہوا کہ بچے میں کوئی مرض ہے جس کی وجہ سے بچہ اگر پیدا ہوا تو یا تو وہ مفلوج پیدا ہوگا یا دماغی صلاحیت سے محروم ہوگا ایسی صورت میں ڈاکٹر ابورشن کے لیے کہیں تو کیا عذر کی صورت میں ابورشن کرانا درست ہوگا؟۔ جواب دے کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔ شمس تبریز، سہسرام

بِسۡمِ اللهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡم

اَلۡجَوَابُ بِعَوۡنِ الۡمَلِکِ الۡوَھَّابِ

کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حمل ٹھہرنے کے چار ماہ بعد پیٹ کے اندر بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے اور اب وہ حکماً ایک جاندار بچہ ہے اس کو ضائع کرنا گویا ایک محترم و بے گناہ انسان کو قتل کرنا ہے جو کہ حرام اشد حرام اور گناہ کبیرہ ہے لہذا استقرار حمل کے چار ماہ بعد حمل ضائع کرنا ناجائز، حرام اور گناہ کبیرہ ہے۔ صحیح بخاری کی روایت ہے:

قَالَ عَبۡدُ اللَّهِ: حَدَّثَنَا رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيۡهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ الصَّادِقُ الۡمَصۡدُوقُ، قَالَ: "إِنَّ أَحَدَكُمۡ يُجۡمَعُ خَلۡقُهُ فِي بَطۡنِ أُمِّهِ أَرۡبَعِينَ يَوۡمًا، ثُمَّ يَكُونُ عَلَقَةً مِثۡلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَكُونُ مُضۡغَةً مِثۡلَ ذَلِكَ، ثُمَّ يَبۡعَثُ اللَّهُ مَلَكًا فَيُؤۡمَرُ بِأَرۡبَعِ كَلِمَاتٍ، وَيُقَالُ لَهُ: اكۡتُبۡ عَمَلَهُ، وَرِزۡقَهُ، وَأَجَلَهُ، وَشَقِيٌّ أَوۡ سَعِيدٌ، ثُمَّ يُنۡفَخُ فِيهِ الرُّوحُ، (الرقم 3208)

"حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ صادق و مصدوق سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تمہارا نطفہ اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن رہتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اس کو جما ہوا خون بنا دیتا ہے پھر چالیس دن بعد اللہ تعالیٰ اس کو گوشت کا لوتھڑا بنا دیتا ہے۔ پھر چالیس دن بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتہ بھیجتا ہے اور اس کو حکم دیتا ہے کہ اس کا عمل، اس کا رزق، اس کی موت اور اس کا برا یا نیک ہونا لکھ دو۔ پھر اس میں روح پھونک دی جاتی ہے۔"

مذکورہ حدیث سے معلوم ہوا کہ استقرار حمل کے چار ماہ بعد پیٹ کے بچے میں روح پھونک دی جاتی ہے۔ لہذا جب اس بچے میں روح پھونک دی گئی تو وہ نفس محترم بن گیا، اب اسے ضائع کرنا ایک محترم و بے گناہ انسان کا قتل ہے جو کہ حرام حرام اشد حرام ہو گا۔ یہی حکم اس صورت میں بھی ہے جب چار ماہ بعد الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ سے بچے میں مہلک مرض کی تشخیص ہو، اس صورت میں بھی چار ماہ کے بعد اسقاط حمل کی ہرگز اجازت نہیں ہوگی۔ کیونکہ چار ماہ بعد اس بچے میں روح پھونک دی گئی ہے اب وہ ایک جاندار بچہ اور انسان ہے جو شرعاً قتل سے محفوظ ہے۔ اس کو یوں سمجھیں کہ جس طرح زمین پر چلنے والے بچے میں اگر کوئی خلقی عیب یا مہلک پیدائیشی مرض ظاہر ہو تو اس کو قتل کرنا جائز نہیں ہے اسی طرح پیٹ کے اس بچے کو بھی قتل کرنا جائز نہیں ہو گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: " وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ "(بنی اسرائیل 33)

ترجمہ: اور کوئی جان جس کی حرمت اللہ نے رکھی ہے ناحق نہ مارو۔

فتاویٰ رضویہ میں ہے: اگر ابھی بچہ نہیں بنا ہے جائز ہے ورنہ ناجائز ہے کہ بے گناہ کا قتل ہے اور چار مہینے میں بچہ بن جاتا ہے۔ (فتاویٰ رضویہ، ج9 ص 615) نیز فتاویٰ رضویہ میں ہے: " جان پڑ جانے کے بعد اسقاط حمل حرام ہے اور ایسا کرنے والا گویا قاتل ہے اور جان پڑنے سے پہلے کوئی ضرورت ہے تو حرج نہیں۔

فتاویٰ رضویہ کے مذکورہ جزئیہ سے یہ مسئلہ بھی واضح ہو گیا ہے کہ استقرار حمل کے بعد چار ماہ سے پہلے کسی عذر یا ضرورت کی وجہ سے اسقاط حمل کی اجازت ہے لہذا اگر الٹرا ساؤنڈ کی رپورٹ سے بچے میں کوئی مہلک مرض معلوم ہو تو اسقاط حمل کی اجازت ہو گی۔ علامہ غلام رسول سعیدی صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں: البتہ اگر استقرار حمل کے بعد چاہ ماہ گزرنے سے پہلے میڈیکل ٹیسٹ سے یہ معلوم ہو جائے کہ اگر بچہ پیدا ہوا تو اس میں کوئی غیر معمولی عیب یا مرض ہو گا مثلا ہیموفیلیا کی بیماری ہو جس میں جسم سے خون نکلنے کے بعد جمتا نہیں ہے یا مونسٹر ہو جس میں کھوپڑی میں پورا یا اصلا دماغ نہیں ہوتا، ایسی صورت میں اسقاط کر دینا چاہیے۔ (شرح صحیح مسلم۔ ج3 ص898)

تاہم بلا ضرورت اور بلا عذر ایک دن کا بھی حمل ساقط کروانا، ناجائز و گناہ ہے۔ فتاوی قاضی خان میں ہے: " واذا اسقطت الولد بالعلاج ان لم یستبن شئ من خلقه ،فلا اقلّ من ان یلحقها اثم ھھنا اذا اسقطت بغیر عذر ، الّا لا تأثم اثم القتل " ۔ ترجمہ: دواء کے ذریعے عورت کا حمل ساقط کروانا، اگرچہ بچے کے اعضا نہ بنے ہوں (یعنی اس میں جان نہ پڑی ہو)، اس کا کم سے کم حکم یہ ہے کہ اگر کسی مجبوری کے بغیر حمل ساقط کروایا، تو عورت گنہگار ہو گی، البتہ قتل والا گناہ نہیں ہو گا۔ (فتاوی قاضی خان، ج3، ص312،)

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ عَزَّوَجَلَّ

وَرَسُوْلُه اَعْلَم صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّم



اسوۂ نبوی میں ایفائے عہد کی اہمیت

از: سیدہ غوثی

سیرت

وہ بات جسے کوئی شخص پورا کرنا خود پر لازم کر لے اور "وعدہ" کہلاتا ہے اس کا پورا کرنا ضروری ہے اور یہ (ایفائے عہد) تمام اوصاف حسنہ میں سے ایک بہترین وصف ایفائے عہد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن و احادیث میں بہ کثرت ایفائے عہد کی تعلیم دی گئی ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (بنی اسرائیل:34)

ترجمہ: اور عہد پورا کرو بیشک عہد سے سوال ہونا ہے۔" اس آیت سے معلوم ہوا کہ ایفائے عہد ایک اہم امر شرعی اور مطلوب خدا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایفائے عہد کی اہمیت اور عہد پورا کرنے والے کی فضیلت کو اجاگر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: تمہارے بہترین لوگ وہ ہیں جو وعدہ پورا کرتے ہیں۔ (مسند ابی یعلیٰ، ج1، ص451، حدیث:1047)

وعدہ خلافی کرنے والے کی مذمت بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اس شخص کا کچھ دین نہیں جو وعدہ پورا نہیں کرتا۔ (معجم کبیر، ج10، ص227، حدیث:10553)

مذکورہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت مطہرہ نے جہاں ایفائے عہد کی عظمت، اہمیت اور فضیلت کو اجاگر کیا ہے، وہیں عہد شکنی کی ہولناکی اور اس کے تباہ کن نتائج کو بھی واضح فرمایا ہے، تاکہ اہل ایمان کے دلوں میں وعدہ پورا کرنے کی قدر و منزلت راسخ ہو جائے اور ان کے مزاج میں وعدہ خلافی سے فطری نفرت پیدا ہو۔

ایفائے عہد چونکہ مکارم اخلاق کا نہایت درخشاں وصف اور صفاتِ حسنہ کے ماتھے کا جھومر ہے، اس لیے یہ صفت جلیلہ حضور نبی اکرم ﷺ کی سیرت طیبہ میں اپنی کامل شان اور پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر نظر آتی ہے۔ آپ ﷺ نے ہر حال، ہر موقع اور ہر مرحلے پر وعدوں کی پاسداری کا بے مثال نمونہ پیش فرمایا۔ اپنے عزیزوں اور جاں نثاروں سے کیے گئے وعدوں کو بھی پورا فرمایا اور اپنے سخت ترین دشمنوں سے کیے گئے عہد سے بھی سرِ مو انحراف نہ کیا۔ بلکہ ہر حال میں ایفائے عہد کا ایسا بے نظیر عملی نمونہ پیش فرمایا کہ تاریخِ عالم کے صفحات پر وفاداری، دیانت اور اعلیٰ اخلاق کا ایک ایسا لازوال نقش ثبت ہو گیا، جس کی

خوشبو آج بھی پوری انسانیت کو معطر کر رہی ہے۔ ذیل میں رسولِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے ایفائے عہد کے چند درخشاں اور ایمان افروز واقعات پیش کیے جاتے ہیں، جو آپ ﷺ کی وعدہ وفائی، امانت داری اور اعلیٰ اخلاق کا روشن ثبوت ہیں۔

اعلان نبوت سے قبل ایفائے عہد:

حضرت ابو الحمساء رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اعلان نبوت سے پہلے میں نے حضور ﷺ سے کچھ سامان خریدا اسی سلسلے میں آپ کی کچھ رقم میرے ذمے باقی رہ گئی میں نے آپ ﷺ سے کہا کہ آپ یہیں ٹھہریئے میں ابھی ابھی گھر سے رقم لا کر اسی جگہ پر آپ ﷺ کو دیتا ہوں۔ حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اسی جگہ ٹھہرے رہنے کا وعدہ فرمالیا مگر میں گھر آکر اپنا وعدہ بھول گیا پھر تین دن کے بعد مجھے جب خیال آیا تو رقم لے کر اس جگہ پر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور ﷺ اُسی جگہ ٹھہرے ہوئے میرا انتظار فرما رہے ہیں۔ مجھے دیکھ کر ذرا بھی آپ ﷺ کی پیشانی پر بل نہیں آیا اوراس کے سوا آپ ﷺ نے اور کچھ نہیں فرمایا کہ اے نوجوان! تم نے تو مجھے مشقت میں ڈال دیا کیونکہ میں اپنے وعدے کے مطابق تین دن سے یہاں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ (شفا74)

حالت جنگ میں ایفائے عہد:

غزوۂ بدر تاریخ اسلام کا مشہورہ غزوہ ہے جس میں 313 فرزندان توحید نے سامان حرب ضرب سے لیس ایک لشکر جرار کا مقابلہ کیا۔ مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر دو جلیل القدر صحابی حضرت حذیفہ اور حضرت حسیل رضی اللہ عنہما کہیں سے آرہے تھے کہ راستے میں کفّار نے پکڑ لیا اور کہا: تم محمد عربی (ﷺ) کے پاس جارہے ہو؟ جب ان دونوں حضرات نے شریکِ جنگ نہ ہونے کا عہد کیا تب کفار نے انہیں چھوڑا، وہاں سے بچ کر یہ لوگ سیدھا حضور کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور تاخیر سے حاضر ہونے کا عذر بیان فرمایا اور کفار سے شریک جنگ نہ ہونے کے اپنے وعدہ کا بھی ذکر کیا۔ آقا ﷺ نے سارا ماجرا سُن کر دونوں کو اسلامی لشکر سے الگ کر دیا اور مسلمانوں کی طرف سے جنگ کرنے سے باز رکھا اور فرمایا: ہم ہر حال میں عہد کی پابندی کریں گے ہمیں صرف اللہ عَزَّوَجَلَّ کی مدد درکار ہے۔ (مسلم)

کفار سے کیے ہوئے وعدہ کی تکمیل:

ہجرت کے چھٹے سال حدیبیہ کے مقام پر کفار قریش اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان تاریخی صلح ہوئی جسے "صلح حدیبیہ" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس صلح نامہ میں ایک شرط یہ بھی قرار پائی کہ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ چلا جائے تو واپس کر دیا جائے لیکن اگر کوئی مسلمان مدینہ سے مکہ میں چلا جائے تو وہ واپس نہیں کیا جائے گا۔ چنانچہ صلح حدیبیہ سے فارغ ہو کر جب حضور ﷺ مدینہ واپس تشریف لائے تو سب سے پہلے جو بزرگ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے وہ حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ تھے۔ کفار مکہ نے فوراً ہی دو آدمیوں کو مدینہ بھیجا کہ ہمارا آدمی واپس کر دیجیے۔ حضور ﷺ نے حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ "تم مکے چلے جاؤ، تم جانتے ہو کہ ہم نے کفار قریش سے معاہدہ کر لیا ہے اور ہمارے دین میں عہد شکنی اور غداری جائز

نہیں ہے "حضرت ابو بصیر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کیا آپ مجھ کو کافروں کے حوالہ فرمائیں گے تا کہ وہ مجھ کو کفر پر مجبور کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم جاؤ! خداوند کریم تمہاری رہائی کا کوئی سبب بنا دے گا۔

(سیرت مصطفی)

باب سیرت سے یہ چند مثالیں بطور نمونہ پیش کی گئی ہیں، ورنہ سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اس نوعیت کے بے شمار واقعات موجود ہیں جو اس حقیقت پر روشن دلیل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے ساتھ بھی کیے گئے عہد و پیمان کی ہر حال میں پاسداری فرمائی اور اپنی امت کو ایفائے عہد کا ایسا بے مثال عملی نمونہ عطا فرمایا جس کی نظیر تاریخ انسانیت میں مشکل سے ملتی ہے۔ سیرت طیبہ کا یہ پہلو ہمیں یہ درس دے رہا ہے کہ مسلمان کی شان عہد کی وفاداری اور قول و عمل کی سچائی میں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

تلاوت قرآن مجید کے فضائل

حضرت خفیف بن حارث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نے فرمایا: اے معاذ! اگر تمہارا سعادت مندوں کے سے عیش اور شہیدوں کی سی موت اور یوم محشر میں نجات اور روزِ قیامت کے خوف سے امن، اندھیروں کے دنوں نور اور گرمی کے دن سایہ اور پیاس کے دن سیر ابی اور ہلکا پن کی جگہ وزن داری اور گمراہی کے دن ہدایت کا ارادہ ہے تو قرآن پڑھتے رہو کہ یہ رحمٰن کا ذکرِ پاک ہے اور شیطان سے حفاظت کا ذریعہ ہے اور حساب اور کتاب کے ترازو میں رجحان (جھکنے) کا سبب ہے۔

(کنزالعمال، 1/272)

سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی بارگاہِ الٰہی میں مقبولیت

از: حافظ افتخار احمد قادری برکاتی، پیلی بھیت، مغربی اترپردیش

شخصیات

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا اسمِ گرامی تاریخِ اسلام کے ان درخشاں نفوسِ قدسیہ میں شمار ہوتا ہے جنہیں اگرچہ ظاہری طور پر صحبتِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف حاصل نہ ہوا لیکن اخلاص، ایثار، اطاعتِ الٰہی، خدمتِ والدہ اور تزکیہ نفس کی برکت سے وہ ایسا مقام پا گئے کہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جلیل القدر صحابہ بالخصوص امیر المومنین حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو ان کی تلاش کا حکم دیا، ان تک اپنا سلام پہنچانے کی تلقین فرمائی اور ان سے دعائے مغفرت کی درخواست کرنے کی ہدایت ارشاد فرمائی۔ اسلامی تاریخ میں یہ ایک منفرد اعزاز ہے کہ ایک تابعی کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدر بلند کلمات ارشاد فرمائے اور اس کی روحانی رفعت کو اپنی زبانِ اقدس سے آشکار فرمایا۔

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ یمن کے مشہور قبیلہ مراد کی شاخ "قرن" سے تعلق رکھتے تھے۔ اسی نسبت سے آپ "قرنی" کہلائے۔ آپ کی زندگی کا سب سے نمایاں وصف اپنی ضعیف والدہ کی بے مثال خدمت تھا۔ یہی وہ وصف تھا جس نے انہیں بارگاہِ الٰہی میں ایسا محبوب بنایا کہ ان کی دعا رد نہ ہوتی، ان کی قسم پوری کی جاتی اور انہیں امتِ محمدیہ کی ایک عظیم جماعت کی شفاعت کا مژدہ عطا کیا گیا۔ امیر المومنین حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: میری امت کے آخری لوگوں میں ایک شخص ہوگا جسے اویس قرنی کہا جائے گا، اس کے جسم میں برص کی بیماری ہوگی، پھر اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمائے گا اور صرف ایک چھوٹا سا نشان باقی رہے گا تاکہ وہ ہر وقت اپنے رب کی نعمت کو یاد رکھے۔ پھر فرمایا کہ اے عمر! جب تمہاری اس سے ملاقات ہو تو میری طرف سے اسے سلام کہنا اور اس سے اپنے لیے دعا کروانا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک بڑی عظمت والا اور اپنی والدہ کے ساتھ نہایت حسنِ سلوک کرنے والا اور اگر وہ اللہ کے نام پر قسم اٹھا لے تو اللہ تعالیٰ ضرور پوری فرماتا ہے نیز وہ ربیعہ اور مضر جیسے عظیم قبائل کی تعداد کے برابر لوگوں کی شفاعت کرے گا۔

(جمع الجوامع، جلد ۹، صفحہ ۱۶۱، حدیث: ۲۷۹۲۹)

محترم قارئین! غور کیجیے کہ جس شخصیت کے بارے میں خود نبی کریم ﷺ اپنے خلیفہ راشد کو سلام پہنچانے کا حکم دیں اس کی روحانی عظمت کا اندازہ انسانی عقل کی رسائی سے ماوراہے۔ یہ مقام نسب، مال، اقتدار یا شہرت سے حاصل نہیں ہوا بلکہ اخلاص، تقویٰ اور خدمتِ والدہ کے باعث نصیب ہوا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے ہی روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: عنقریب تمہارے پاس ایک ایسا شخص آئے گا جسے لوگ اویس کے نام سے جانیں گے۔ اس کے جسم پر سفید داغ ہوں گے، پھر وہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے گا اللہ تعالیٰ اسے شفا عطا فرمادے گا۔ تم میں سے جو شخص اس سے ملے وہ اس سے اپنے لیے مغفرت کی دعا ضرور کروائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، جلد ۷، صفحہ ۵۳۹، حدیث: ۲)

صحیح مسلم میں حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے پاس یمن سے اویس بن عامر آئیں گے۔ وہ قبیلہ مراد اور قرن کے رہنے والے ہوں گے۔ ان کے جسم پر برص تھا جس سے وہ شفایاب ہو گئے، صرف ایک درہم کے برابر نشان باقی رہ گیا، ان کی والدہ زندہ ہوں گی اور وہ ان کی بڑی خدمت کرنے والے ہوں گے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم کھائیں تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور پورا فرمائے گا۔ لہٰذا! اگر تمہیں ان سے دعا کروانے کا موقع ملے تو ضرور کروانا۔

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۲۵۴۲)

محترم قارئین! یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک مقبولیت کا معیار ظاہری شہرت نہیں بلکہ باطنی طہارت ہے۔ کتنے ہی ایسے لوگ دنیا میں گمنام رہتے ہیں لیکن آسمانوں میں ان کا ذکر فرشتوں کی مجلسوں میں ہوتا ہے۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ اسی حقیقت کا زندہ نمونہ تھے۔ نبی کریم ﷺ کی اس بشارت کے بعد حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ہمیشہ یمن سے آنے والے قافلوں کا انتظار کرتے اور ہر قافلے سے حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے متعلق دریافت فرماتے۔ یہ منظر اسلامی تاریخ کا نہایت ایمان افروز باب ہے کہ ایک عظیم خلیفہ وقت ایک ایسے درویش کی تلاش میں سرگرداں ہے جس کے پاس نہ سلطنت ہے، نہ مال و دولت، نہ شہرت اور نہ دنیاوی منصب مگر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس کی ایسی عزت کہ خلیفہ وقت بھی اس کی دعا کا محتاج ہے۔

حضرت اسیر بن جابر رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ جب یمن سے لوگ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ ان سے دریافت فرماتے کہ کیا تم میں اویس بن عامر موجود ہیں؟ یہاں تک کہ ایک مرتبہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ تشریف لے آئے۔ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ اویس بن عامر ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: کیا آپ مراد قبیلہ اور قرن کے رہنے والے ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: کیا آپ کو برص تھا اور اب صرف ایک چھوٹا سا نشان باقی رہ گیا ہے؟ عرض کیا: جی ہاں۔ فرمایا: کیا آپ کی والدہ زندہ ہیں؟ عرض کیا: جی ہاں۔ تب حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کو آپ کے بارے میں یہی فرماتے ہوئے سنا ہے۔ پھر آپ سے

اپنے لیے دعائے مغفرت کی درخواست کی چنانچہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے لیے دعا فرمائی۔ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۲۵۴۲)

حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ سے دعائے مغفرت کی درخواست کی تو حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے نہایت عجز و انکسار کے ساتھ عرض کیا کہ دعا کا زیادہ حق تو آپ جیسے جلیل القدر صحابی کو حاصل ہے لیکن حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں نے یہ بات اپنی خواہش سے نہیں کہی بلکہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ اس کے بعد حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ امیر المؤمنین کے لیے دعا فرمائی۔ محترم قارئین! اسلام میں فضیلت کا مدار محض منصب و حکومت نہیں بلکہ تقویٰ، اخلاص اور قربِ الٰہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک طرف پوری اسلامی سلطنت کے فرمانروا حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کھڑے ہیں اور دوسری طرف ایک گمنام درویش مگر خلیفہ وقت اس درویش کی دعا کے طالب ہیں۔ (صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۲۵۴۲)

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی پوری زندگی خدمتِ والدہ سے عبارت تھی۔ ان کی والدہ ضعیف اور معذور تھیں۔ آپ نے ان کی خدمت کو اپنی عبادت سمجھا اور اسی سبب مدینہ منورہ حاضر ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے۔ محدثین اور مؤرخین نے لکھا ہے کہ آپ مدینہ منورہ تک پہنچے لیکن اس وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر پر موجود نہ تھے۔ والدہ کی اجازت محدود تھی اس لیے آپ انتظار کیے بغیر واپس یمن روانہ ہو گئے۔ بظاہر یہ محرومی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہی اطاعت و ایثار ان کی سب سے بڑی سعادت بن گئی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام عطا فرمایا کہ قیامت تک ان کا نام احترام سے لیا جاتا رہے گا۔ (حلیۃ الاولیاء، جلد ۲، صفحہ ۸۷)

والدین کی خدمت کبھی بھی نفلی عبادات سے کم نہیں ہوتی۔ اگر کسی شخص کے سامنے ایک طرف اپنی خواہش ہو اور دوسری طرف والدین کی رضا تو اللہ تعالیٰ کی رضا والدین کی رضا میں پوشیدہ ہے۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے اسی حقیقت کو اپنی عملی زندگی سے ثابت کیا۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ زہد و قناعت کا پیکر تھے۔ دنیا کی چمک دمک سے انہیں کوئی رغبت نہ تھی۔ لباس انتہائی سادہ، خوراک نہایت معمولی اور رہائش بے حد سادہ تھی۔ اکثر اوقات جنگلوں اور ویران مقامات میں عبادت و ریاضت میں مشغول رہتے۔ جب کوئی شخص آپ کی تعریف کرتا تو آپ رونے لگتے اور فرماتے کہ لوگوں کو میرے ظاہر کا علم ہے میرے باطن کو میرا رب ہی جانتا ہے۔ (صفۃ الصفوۃ، جلد ۳، صفحہ ۳۹) حضرت ابو نعیم اصفہانی رحمۃ اللہ علیہ نے نقل کیا کہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ راتوں کو طویل قیام کرتے، کبھی پوری رات رکوع میں گزارتے اور کبھی مکمل رات سجدے میں بسر کر دیتے۔ جب صبح ہوتی تو فرماتے کہ کاش بندہ ہمیشہ اپنے رب کے حضور جھکا رہے اور کبھی غفلت میں مبتلا نہ ہو۔ ان کی آنکھوں سے خوفِ خدا میں اتنے آنسو جاری ہوتے کہ داڑھی مبارک تر ہو جاتی۔ (حلیۃ الاولیاء، جلد ۲، صفحہ ۸۶)

آپ کا دل ہمیشہ آخرت کی فکر سے لبریز رہتا۔ دنیا کا کوئی معاملہ آپ کو اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل نہ کرتا۔ جب قبر، حشر یا حساب کا ذکر ہوتا تو شدتِ رقت سے بے اختیار رونے لگتے۔ فرماتے کہ انسان کو اپنے انجام کی فکر اس قدر ہونی چاہیے کہ دنیا کی تمام خواہشات اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوں۔ (سیر اعلام النبلاء، جلد ۴، صفحہ ۳۳)

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا ایک عظیم وصف یہ بھی تھا کہ وہ اپنی عبادت اور نیکیوں کو لوگوں سے مخفی رکھتے تھے۔ انہیں شہرت سے سخت نفرت تھی۔ حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے جب انہیں بیت المال سے وظیفہ لینے کی پیش کش کی تو انہوں نے نہایت ادب سے انکار کرتے ہوئے عرض کیا کہ جب تک میرے پاس ضرورت بھر کا رزق موجود ہے میں کسی اور کا حق لینا مناسب نہیں سمجھتا۔ (الاستیعاب، جلد ۱، صفحہ ۱۸۸)

حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم بھی حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے فضل و کمال کے معترف تھے۔ متعدد اہلِ سیر نے ذکر کیا کہ بعد کے زمانے میں حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ حضرت سیدنا علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے لشکر میں شامل ہوئے اور جنگِ صفین میں حق کی حمایت کرتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی پوری زندگی عبادت، خدمت اور اطاعت میں گزاری اور آخر کار شہادت کی عظیم نعمت بھی حاصل کی۔

(اسد الغابہ، جلد ۱، صفحہ ۲۲۷، سیر اعلام النبلاء، جلد ۴، صفحہ ۳۵)

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس حقیقت کا روشن استعارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قبولیت کے لیے ظاہری شہرت یا کثرتِ علم کافی نہیں بلکہ خلوصِ نیت، اطاعتِ الٰہی، والدین کی خدمت، عاجزی، خوفِ خدا اور اخفائے اعمال بنیادی اسباب ہیں۔ یہی اوصاف تھے جنہوں نے ایک گمنام تابعی کو وہ عظمت عطا کی کہ ان کا تذکرہ احادیثِ نبویہ کا حصہ بن گیا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ان کی دعا کے مشتاق رہے۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی زندگی کا ہر گوشہ اخلاص، خشیتِ الٰہی اور ترکِ دنیا کی عملی تفسیر تھا۔ آپ نے کبھی اپنے روحانی مقام کو لوگوں کے سامنے ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہمیشہ گمنامی کو پسند فرمایا۔ اکابرِ محدثین و مؤرخین نے لکھا کہ جب لوگوں کو آپ کے مقام و مرتبہ کا علم ہونے لگا اور ہر شخص آپ سے دعا کی درخواست کرنے لگا تو آپ نے شہرت سے بچنے کے لیے اپنا مقام بدل لیا۔ آپ فرماتے تھے کہ بندہ مومن کا اصل سرمایہ لوگوں کی تعریف نہیں بلکہ اپنے رب کی رضا ہے اس لیے جس قدر ممکن ہو اپنے اعمال کو اخفا میں رکھا جائے۔

(حلیۃ الاولیاء، جلد ۲، صفحہ ۸۸)

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے متعلق نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان کہ "اگر وہ اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھالیں تو اللہ تعالیٰ ضرور اسے پورا فرماتا ہے" درحقیقت ان کے مقامِ ولایت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اولیائے کاملین کی ایک نمایاں شان یہی ہوتی

ہے کہ ان کی دعائیں بارگاہِ الٰہی میں شرفِ قبولیت حاصل کرتی ہیں۔ لیکن حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے کبھی اس مقام کو باعثِ فخر نہیں بنایا بلکہ ہمیشہ اپنے آپ کو گناہگار سمجھتے رہے۔ یہی عجز و انکسار انہیں دیگر اہلِ کمال سے ممتاز کرتا ہے۔

(صحیح مسلم، کتاب الفضائل، حدیث: ۲۵۴۲)

حضرت امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح مسلم کی شرح میں لکھا کہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے فضائل پر مشتمل یہ حدیث اس بات کی واضح دلیل ہے کہ بعض اوقات ایک تابعی بھی اپنے مخصوص اوصاف اور اخلاص کی وجہ سے غیر معمولی روحانی مرتبہ پالیتا ہے۔ اسی لیے نبی کریم ﷺ نے حضرت سیدنا عمر فاروق اعظم رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کو ان سے دعا کروانے کی تلقین فرمائی۔ امام نووی مزید لکھتے ہیں کہ اس روایت میں اہلِ صلاح سے دعا کروانے کے استحباب پر بھی واضح استدلال موجود ہے۔ (شرح صحیح مسلم للنووی، جلد ۱۶، صفحہ ۹۵)

حافظ ابن حجر عسقلانی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کے زہد، تقویٰ، خدمتِ والدہ اور قبولیتِ دعا کو ان کی سب سے نمایاں خصوصیات قرار دیا ہے۔ انہوں نے لکھا کہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی عظمت کا سب سے بڑا سبب ان کا کامل اخلاص اور والدہ کی بے مثال خدمت تھی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ مقام عطا فرمایا جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ (الاصابہ فی تمییز الصحابہ، جلد ۱، صفحہ ۲۹۵)

امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کو تابعین کے اکابر زاہدین میں شمار کرتے ہوئے لکھا کہ وہ عبادت، خشیت، فقر، توکل اور اخلاص کا ایسا نمونہ تھے جس کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ دنیا ان کی نگاہ میں بے حقیقت تھی جبکہ آخرت ان کی زندگی کا اصل مقصود تھی۔ ان کے شب و روز اللہ تعالیٰ کی یاد، عبادت اور فکرِ آخرت میں گزرتے تھے۔

(سیر اعلام النبلاء، جلد ۴، صفحہ ۳۲ تا ۳۶)

مؤرخین نے ذکر کیا کہ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ نے اپنے نفس کی اصلاح کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد بنایا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ انسان دوسروں کے عیوب تلاش کرنے کے بجائے اپنے نفس کا محاسبہ کرے کیونکہ قیامت کے دن ہر شخص سے اس کے اپنے اعمال کے متعلق سوال ہوگا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کسی کی غیبت، تحقیر یا عیب جوئی سے سخت اجتناب کرتے تھے۔

(صفۃ الصفوۃ، جلد ۳، صفحہ ۴۱)

حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی پوری حیات اس حقیقت کا اعلان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قربت کا راستہ شہرت، اقتدار یا کثرتِ مال سے نہیں بلکہ اطاعت، تقویٰ، عاجزی اور خدمتِ خلق سے ہو کر گزرتا ہے۔ انہوں نے اپنی والدہ کی خدمت کو اس اخلاص کے ساتھ انجام دیا کہ اس کی برکت سے انہیں وہ عظیم روحانی مرتبہ حاصل ہوا جس کا اعتراف خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا۔

آج کے دور میں جبکہ مادیت، خود غرضی اور شہرت کی خواہش نے انسان کو اپنی گرفت میں لے رکھا ہے۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کا کردار امتِ مسلمہ کے لیے ایک زندہ پیغام ہے۔ ان کی سیرت ہمیں اخلاص، ایثار، تواضع، صبر، قناعت، والدین کی خدمت، عبادت، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کی دعوت دیتی ہے۔ اگر مسلمان ان اوصاف کو اپنی زندگی کا حصہ بنالیں تو انفرادی کردار بھی سنور جائے اور اجتماعی معاشرہ بھی خیر و برکت کا گہوارہ بن جائے۔ حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کی شخصیت اس حقیقت کی بھی آئینہ دار ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو کبھی ظاہری جاہ و جلال سے نہیں پہچنواتا بلکہ ان کے اخلاق، تقویٰ، اخلاص اور اعمالِ صالحہ ہی ان کی اصل پہچان ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا شخص جسے دنیا زیادہ نہ جانتی تھی، آسمانوں میں اس کا ذکر تھا اور نبی کریم صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس کا تعارف اپنی امت کو کرایا۔ یہی ان کی سب سے بڑی فضیلت اور دائمی عظمت ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضرت سیدنا اویس قرنی رضی اللہ عنہ کے اخلاص، تقویٰ، خدمتِ والدین، خوفِ خدا، تواضع اور حسنِ عمل سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں بھی اپنے مقرب بندوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین

☆☆☆☆☆☆☆

حدیث

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ: وقت پر ادا کی ہوئی نماز، اللہ تعالیٰ کو سب کاموں سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

(صحیح البخاری، حدیث 527)

حدیث

رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے ارشاد فرمایا کہ: تم میں سب سے افضل شخص وہ ہے جو قرآن مجید سیکھے اور سکھائے۔

(صحیح بخاری، حدیث: ۵۰۲۷)



حضرت امام زید شہید رضی اللہ عنہ

از: مولانا فہیم احمد ثقلینی ازھری، جامعۃ المصطفی، ککرالہ ضلع بدایوں شریف

شخصیات

حضرت امام زید شہید رضی اللہ عنہ، ائمۂ اہل بیت میں سے ایک عظیم فرد ہیں۔ امام چہارم حضرت سیدنا امام علی زین العابدین رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند اور امام پنجم حضرت سیدنا امام محمد باقر رضی اللہ عنہ کے برادر مکرم ہیں، اس طریقے سے آپ بابِ مدینۃ العلم حضرت مولا علی مرتضی رضی اللہ عنہ کی اولاد پاک سے ہوئے، آپ کی ولادت مدینہ منورہ میں ۷۵/ ہجری میں ہوئی، آپ کے والد ماجد حضرت امام زین العابدین کو جب آپ کی ولادت کی نوید پہنچی، تو انہوں نے قرآن کھولا، تو سامنے یہ آیت کریمہ تھی:"اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَ اَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ"یعنی اللہ تعالی نے مسلمانوں کے جان اور مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ حضرت امام زین العابدین نے قرآن بند کیا، پھر دوبارہ کھولا، تو نظر اس آیتِ کریمہ پر رکی "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ"یعنی اور جو اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے ہر گز انہیں مردہ خیال نہ کرنا بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انہیں رزق دیا جاتا ہے۔ حضرت امام زین العابدین نے قرآن بند کیا اور پھر کھولا تو یہ آیت کریمہ دکھائی دی"وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ" اللہ تعالی نے مجاہدین کو فضیلت عطا فرمائی ہے، اس کے بعد حضرت امام زین العابدین قرآن بند کیا اور فرمایا یہ بچہ مرتبہ شہادت حاصل کرے گا۔

خانوادہ نبوت مدینہ منورہ کی علمی روحانی فضا اور حضرت امام زین العابدین کے علم و فضل کے روحانی ماحول میں حضرت امام زید نے ہوش سنبھالا اور فیضان حاصل کیا، تربیت پائی، اکتساب علم کیا، حضرت امام زید شرفِ نسب اور علم و فضل کی وجہ سے اپنے اقران و اماثل پر فائق تھے۔ اِس خاندان اہل بیت پر ہمیشہ شدائد اور محن نازل ہوتے رہے، ان کے اطوار میں کوئی فرق نہ آیا، خلق خدا کی دادرسی و دستگیری، خدمت خلق کا جذبہ زہد و اتقا اور عوام سے رحمت کا برتاؤ یہ سب شمائل و خصائل نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے ہوئے حضرت امام زید شہید کی سیرت مبارکہ میں بھی رچ بس گئے۔ خاندان اہل بیت کا شرف علم سے بھی غیر معمولی حیثیت رکھتا ہے، غم و ابتلا کی یورش نے ان حضرات کے لیے جس چیز کو وسیلۂ امن و سکون بنا دیا تھا، وہ علم تھا، وقت کی

سیاست نے انہیں شکستہ دل کر دیا تھا، اس لیے دنیا و مافیہا سے منہ موڑ کر انہوں نے اپنے آپ کو ہمہ وقت علم کی طرف متوجہ کر لیا تھا، ان حالات میں ہمیں کوئی تعجب نہیں ہوتا جب ہم اس خاندان گرامی قدر میں جو بیک وقت بیت نبوت اور بیت علم تھا، ائمہ و مجتہدین کی ایک پوری جماعت پاتے ہیں، الغرض یہ تھا وہ گہوارۂ علم و فضل، جس میں امام زید نے ہوش و خرد کی آنکھیں کھولیں، نشو نما پائی اور قرآن کی طرف متوجہ ہوئے تو حفظ کر لیا، قران کریم کے بعد آپ نے اپنے والد ماجد حضرت امام زین العابدین کے طریق سے سیدنا امام حسن، سیدنا امام حسین اور امام محمد بن حنفیہ سے احادیث روایت کی ہیں۔ حضرت امام زید شہید اہلِ بیتِ اطہار کے جلیل القدر عالم، فقیہ، زاہد اور مجاہد تھے، اہلِ سنت کے نزدیک آپ صالح، عادل اور حق گو امام تھے۔

امام زید شہید اساطین امت کی نظر میں

آپ کا شمار تابعین میں ہوتا ہے، امام ابن حبان رقم طراز ہیں۔"رَأٰی جَمَاعَةٌ مِنْ أَصْحَابِ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ "یعنی حضرت امام زید شہید نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک جماعت کی زیارت کی ہے۔

(الثقات لابن حبان 4/249)

حضرت امام زید نے اپنے والد گرامی سیدنا امام زین العابدین، اپنے بھائی سیدنا امام محمد باقر، حضرت ابان بن عثمان، حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت عبید اللہ بن ابی رافع رضی اللہ عنہم جیسے اکابر تابعین سے براہ راست حدیث روایت کی ہے۔

(تھذیب التھذیب للعسقلانی 3/362)

امام موفق بن احمد المکی اور صاحب سیرۃ الشامیہ امام محمد بن یوسف صالحی نے امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کے شیوخ حدیث کی فہرست میں امام زید کا نام درج کیا ہے۔ (عقود الجمان صفحہ 72۔)

امام محمد باقر کے صاحب زادے امام ششم حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے اپنے چچا امام زید شہید کے علمی مقام کو درج ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔ كَانَ وَاللّٰهِ أَقْرَأَنَا لِكِتَابِ اللّٰهِ، وَأَفْقَهَنَا فِي دِينِ اللّٰهِ، وَأَوْصَلَنَا لِلرَّحِمِ، وَاللّٰهِ مَا تَرَكَ فِينَا لِدُنْيَا وَلَا لِآخِرَةٍ مِثْلَهُ.

اللہ رب العزت کی قسم امام زید ہم میں سب سے زیادہ قرآن کو پڑھنے والے، اللہ کے دین کی ہم میں سب سے زیادہ سمجھ بوجھ رکھنے والے، اور ہم میں سب سے زیادہ صلہ رحمی کرنے والے تھے، اللہ تعالی کی قسم دنیا اور آخرت میں اب ہم میں ان کی مثل کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ (تھذیب الکمال للمزی، 10/97)

حضرت امام جعفر صادق نے ایک اور موقع پر امام زید کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:"رَحِمَ اللّٰهُ عَمِّي، كَانَ وَاللّٰهِ سَيِّدًا، لَا وَاللّٰهِ مَا تَرَكَ فِينَا لِدُنْيَا وَلَا لِآخِرَةٍ مِثْلَهُ "اللہ تعالی میرے چچا حضرت زید پر رحم فرمائے، اللہ رب العزت کی قسم! وہ سردار تھے۔ اللہ تعالی کی قسم دنیا اور آخرت میں اب ہمارے درمیان ان کی مثل کوئی بھی موجود نہیں۔

(تاریخ مدینۃ دمشق لابن عساکر 19/458)

محدث اکبر امام شعبی (104ھ) نے امام زید کے متعلق فرمایا "واللہ ماولدت النساء افضل من زید بن علی، ولاافقه، ولا اشجع، ولاازهد" (المواعظ والاعتبار بذکر الخطط والآثار، 3/438)

اللہ تعالی کی قسم! کسی عورت نے بھی امام زید بن علی سے زیادہ فضیلت کا حامل، ان سے زیادہ فقیہ، ان سے زیادہ شجاع، ان سے زیادہ زاہد پیدا نہیں کیا۔

امام ابو اسحاق السبیعی (128ھ) نے امام زید کے متعلق فرمایا کیا: رَأَیتُ زیدَ بن علی، فلم ار فی اھْلِہٖ، ولا اعلمُ مِنه، ولا افضَل، وکانَ افصحھم لسانًا، وکثرھم زھدًا، و بیانًا" (ایضًا)

میں نے حضرت امام زید بن علی کو دیکھا، میں نے ان کے گھر والوں میں سے کسی ایک کو بھی ان کی مثل نہ پایا، نہ ان سے بڑھ کر کسی کو علم میں پایا اور نہ ہی کسی کو فضل میں ان سے زیادہ دیکھا وہ سب لوگوں میں سب سے زیادہ فصیح للسان تھے، زہد اور بیان میں سب سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

امام اعمش (147ھ) آپ کے متعلق بیان کرتے ہیں، ماکانَ فی اھلِ زید بن علیٍّ مثل زید ولا رأیتُ فِیهِم اَفضلُ مِنه، ولااَفصحُ، ولااَعلمُ، ولااَشجَعُ" (ایضًا)

یعنی امام زید بن علی کے گھرانے میں کوئی بھی امام زید کی مثل نہیں ہوا، میں نے ان کے گھرانے میں اس سے زیادہ فضیلت والا، ان سے زیادہ فصاحت والا، ان سے زیادہ علم والا اور ان سے زیادہ بہادر کسی کو نہیں دیکھا۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے حضرت امام زید شہید کے علمی مقام پر یوں اظہار خیال فرمایا ہے:

" شاھدت زیدَبن علیٍّ کما شاھدت اھله، فما رأیت فی زمانه افقه منه، ولا اعلم، ولا اسرع جوابا، ولا ابین قولا" (الروض النضیر)

میں حضرت امام زید کی بارگاہ میں بھی حاضر ہوا، جس طرح ان کے خاندان سے شرف نیاز حاصل کیا۔ میں نے ان کے زمانے میں ان سے زیادہ فقیہ، ان سے زیادہ عالم، ان سے زیادہ حاضر جواب اور ان سے زیادہ بات کی وضاحت کرنے والا کسی کو نہیں دیکھا۔

مشہور محدث امام مزی نے اپنی کتاب 'تہذیب الکمال میں حضرت امام زید کے تعارف میں لکھا ہے: " روٰی له ابوداؤد والترمذی، والنسائی فی مسند علی، وابن ماجة"

یعنی یعنی امام ابو داؤد اور امام ترمذی نے اپنی سنن میں، امام نسائی مسند علی میں، اور امام ابن ماجہ نے اپنی سنن میں حضرت امام زید شہید سے احادیث روایت کی ہیں۔

سیدنا امام اعظم ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ نے جن نو ائمۂ اہل بیت سے فقہ و حدیث حاصل کیا ہے ان میں امام زید شہید کا بھی نام ہے۔ امام زید بن علی کے طریق سے امام اعظم ابو حنیفہ کی سند حدیث اس طرح ہے۔ الامام ابو حنیفۃ النعمان، عن الامام زید بن علی، عن الامام علی زین العابدین، عن الامام حسین، عن سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنھم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔

بنو امیہ سے مقابلہ کرنے کے لیے

سیدنا امام اعظم نے امام زید شہید کی مالی امداد بھی فرمائی تھی، میدان میں آنے کو حضور کے میدان بدر میں آنے سے تشبیہ دے کر لوگوں کو آپ کی معیت و رفاقت کے لیے تیار بھی کیا تھا، ایک بیان بھی جاری کیا تھا۔ مگر بنفس نفیس میدان جنگ میں شامل نہ ہوئے، تاہم تحریر و تقریر کے ذریعے امام زید کی معاونت کے لیے اہل کوفہ کی ذہن سازی کرتے رہے۔ اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک حضرت امام زید بن علی شہید کی شہادت کا پس منظر یہ ہے:

امام زید کا زمانہ بنو اُمیہ کے دورِ حکومت خلیفہ ہشام بن عبد الملک سے متعلق ہے۔ اس دور میں بعض حکّام کی طرف سے ظلم و جبر، اہلِ بیت سے سخت رویّہ، بیت المال میں ناانصافیاں اور شریعت کے تقاضوں سے دوری جیسے مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ امام زید نے ان حالات کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منافی سمجھا۔ اہلِ سنت و جماعت کے نزدیک امام زید کا خروج حکومت حاصل کرنے کے لیے نہیں تھا، بلکہ ظلم کے خلاف آواز بلند کرنے، شریعت کی بالادستی اور عدل کے قیام کے لیے تھا، آپ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ "صرف میں ہی خلافت کا حقدار ہوں" بلکہ یہ فرمایا میں تمہیں کتابُ اللہ اور سنتِ رسول ﷺ کی طرف بلاتا ہوں، اہلِ کوفہ نے امام زید کو خطوط لکھے، حمایت کا وعدہ کیا، ہزاروں افراد نے بیعت بھی کی، لیکن جب بنو امیہ کی فوج آئی اور خطرہ بڑھا، تو اپنی قدیم روش کے مطابق اکثریت وعدہ خلافی کر گئی، یہی وہ طرزِ عمل تھا جو اس سے پہلے حضرت علی، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کے ساتھ بھی ہو چکا تھا۔ بہر حال ۱۲۲/ ہجری میں امام زید نے قلیل ساتھیوں کے ساتھ قیام کیا، اور جنگ کے دوران آپ کو تیر لگا، آپ نے جامِ شہادت نوش فرمایا، بعدِ ازاں دشمنوں نے آپ کے جسدِ مبارک کو سولی پر لٹکایا پھر جلا دیا یہ عمل انسانیت کے نزدیک صریح ظلم اور سفاکی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کی ضریح مبارک پر رحمت و نور کی بارش فرمائے، مرقد انور کو منور فرمائے، اور ہم سب کو اہل بیت کی تعلیمات اور نقوش قدم پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

حضرات انبیاء دائمی حیات کے ساتھ زندہ ہیں



از: شیخ الحدیث علامہ افتخار احمد قادری مدنی صاحب

متفرقات

اللہ رب العزت نے انسانوں کی رشد و ہدایت کے لیے انبیاو مرسلین کو مبعوث فرمایا اور ان کو بہت سی امتیازی صفات و خصائص سے بہرور کیا، نہایت اختصار کے ساتھ چند خصائص کا ذکر کیا جارہا ہے۔

انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے پاس اللہ تعالی کی جانب سے وحی آتی ہے، قرآن ناطق ہے۔ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ یُوْحٰۤى اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌۚ (الکہف 110)

ترجمہ: آپ فرمادیں میں بظاہر تمہیں جیسا ہوں میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی ہے۔

خود رب تعالیٰ وحی کی عظمت و جلالت کو بیان فرماتا ہے: لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِؕ-وَ تِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ یَتَفَكَّرُوْنَ۔ (حشر 21)

ترجمہ: اگر ہم یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارتے تو ضرور اسے اللہ تعالی کے خوف سے جھکا ہوا پوائیں، پاش پاش دیکھتے اور یہ مثالیں لوگوں کے لیے ہم بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

اس آیت میں قرآن کی جلالت اور رفعت شان اور اس میں نازل ہونے والی حکمتوں اور نصیحتوں کی اثر آفرینی کی ایک جھلک دیکھائی گئی ہے۔ وہ پہاڑ جس کے استحکام اور ثبات کی مثال دی جاتی ہے، اس پہاڑ پر اگر قرآن نازل ہوتا تو وہ پہاڑ بھی قرآن کا بوجھ برداشت نہ کرپاتا بلکہ شق ہو کر پارہ پارہ، ریزہ ریزہ ہو جاتا۔ آپ غور فرمائیں ہمارے نبی ﷺ کا جسم مبارک کتنی عظمت کا حامل ہے جس پر یہ قرآن اترا اور آپ کا سینۂ اقدس کتنی جلالت کا حامل ہے جو قرآن کے اس عظیم بوجھ کا متحمل ہوا۔ نبی ﷺ کے قلب و سینہ کی طاقت و عظمت کا صحیح معنوں میں کوئی شخص ادراک نہیں کر سکتا۔

خود آقا ﷺ کے جسم عظیم پر نزول وحی کے وقت کیا اثر ہوتا تھا؟ اس کیفیت کو ام المؤمنین حضرت عائشہ بیان فرماتی ہیں:

وَلَقَدْ رَأَيْتُهُ يَنْزِلُ عَلَيْهِ الوَحْيُ فِي اليَوْمِ الشَّدِيدِ البَرْدِ، فَيَفْصِمُ عَنْهُ وَإِنَّ جَبِينَهُ لَيَتَفَصَّدُ عَرَقًا۔

(صحیح البخاری، ج 1 ص 2)

جب آپ پر وحی نازل ہوتی تو میں دیکھتی کہ سخت سردی کے دن میں بھی وحی کی کیفیت فرو ہونے کے بعد آپ کی پیشانی مبارک پسینہ سے شرابور ہوتی۔

ایک اور حدیث ملاحظہ ہو: اگر رسول اللہ ﷺ پر وحی اونٹنی پر سوار ہونے کی حالت میں آتی تو اونٹنی وحی کے بوجھ سے بیٹھ جاتی۔ (امام احمد بن حنبل و بیہقی)

ایک اور حدیث میں وارد ہوا کہ صحابہ بیان کرتے ہیں کہ جب سرکار پر وحی اترتی تو جب تک وحی کا سلسلہ قائم رہتا ہم میں سے کسی کی مجال نہ تھی کہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھ سکتا۔ (خصائص الکبریٰ، ج 1 ص 200)

مذکورہ آیت اور ان روایتوں سے وحی کی عظمت کا اندازہ ایک حد تک کیا جا سکتا ہے۔

وحی سے متصف ہونا صرف نبی و رسول کا حصہ ہے اور اس بناء پر صاحب وحی دیگر خلائق سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ وحی کے ذریعہ اس کا اسٹیٹس چینج ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس علو و بلندی پر پہونچ جاتا ہے جہاں افاضل ملائکہ کی بھی رسائی نہیں۔

انبیاء کرام کو ایک امتیاز یہ بھی حاصل ہوتا ہے کہ رب ذوالجلال ان سے براہ راست کلام فرماتا ہے اور ان کو اس عظیم اعزاز سے مشرف فرماتا ہے۔ قرآن ناطق ہے۔ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِيْمًا ۔ (سورہ نساء 64)

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ نے موسیٰ سے حقیقۃً کلام فرمایا۔

ایک اور آیت میں رب تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اس طرح کلام فرمایا: يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَ رَافِعُكَ اِلَيَّ وَ مُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا۔ (آل عمران 55)

اے عیسیٰ میں تمہیں وفات کے بعد اپنی جانب اٹھاؤں گا اور کافروں سے تمہیں پاک کروں گا۔

بلاواسطہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب سے کلام فرمایا: فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى۔ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى۔ (النجم)

ترجمہ: اب وحی فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی۔ دل نے نہ جھٹلایا جو آنکھ نے دیکھا۔

رب نے بے شمار دفعہ اپنے حبیب کو اپنی وحی و کلام سے نوازا ہے۔

تیسرا امتیاز انبیاء علیہم السلام کو یہ حاصل ہوتا ہے کہ صرف ان کی آنکھ سوتی ہیں ان کے دل نہیں سوتے۔ نبی ﷺ نے فرمایا:

"ہم انبیا کی جماعت کا امتیاز یہ ہے کہ ہماری آنکھیں سوتی ہیں اور ہمارے دل نہیں سوتے۔ (الخصائص الکبریٰ ج 1 ص 118)

کیونکہ ان کے قلوب کو ہر لمحہ وحی کے استقبال کے لیے تیار رہنا ہوتا ہے۔

انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام آج بھی اپنی دائمی حیات کے ساتھ زندہ ہیں۔ رب العزت نے عالم بدلنے کے لیے یہ سسٹم رکھا ہے کہ ان کی ارواح مقدس کو قبض کیا جاتا ہے۔ یہ قبض روح وعدہ الٰہی کا ایفاء ہے اور بس، پھر ان کی ارواح مبارکہ کو ان کے اجسام مقدسہ میں لوٹا دیا جاتا ہے۔ اور پھر ہمیشہ کے لیے وہ حیات جاوید اں سے نوازے دیئے جاتے ہیں۔

اس پر سب سے واضح اور قوی دلیل حدیث معراج ہے ۔ سفر معراج میں ایک نہیں بلکہ بہت سی آیات و معجزات اور ایمانی نشانیوں کا ظہور ہوا۔

حدیث معراج کے بارے میں علامہ زرقانی فرماتے ہیں: **حديث المعراج اجمع المسلمون عليه و اعرض عنه الزنادقة الملحدون** "يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ " ۔

حدیث معراج پر اجماع امت ہے، منافقین و ملحدین اس سے اعراض کرتے ہیں۔ یہ منافقین چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منھوں سے بجھادیں لیکن اللہ عزوجل اپنے نور کو آفاق کے ہر گوشہ میں مکمل طور پر پہونچائے گا، اگرچہ یہ بات کافروں کو ناگوار ہو۔

صحیح مسلم کی روایت حدیث میں ہے:

نبی ﷺ نے فرمایا، جب میں شب معراج موسیٰ کے پاس کثیب احمر (سرخ ٹیلے) کے نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ (صحیح مسلم، باب فضائل موسیٰ)

مسلم میں مزید تفصیل یہ ہے کہ سرکار ﷺ فرماتے ہیں: میں نے خود کو انبیا کی جماعت میں پایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ موسیٰ کھڑے نماز میں مصروف ہیں، میانہ قد، گھنگریالے بال، ایسے لگے جیسے شنوءۃ قبیلہ کا کوئی انسان ہو۔ پھر میں کیا دیکھتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم کھڑے نماز میں مشغول ہیں۔ یہ عروہ ابن مسعود ثقفی سے شکلاً مشابہ تھے۔ اسی مبارک جماعت میں حضرت ابراہیم بھی کھڑے نماز میں مصروف ہیں۔ مجھ سے ان کو بڑی مشابہت ہے۔ (یعنی نبی ﷺ فرماتے ہیں کہ میں ان سے بہت مشابہ ہوں کیونکہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام میرے جد امجد ہیں۔) ان حضرات انبیا کی میں نے امامت کی۔ جب میں نماز سے فارغ ہوا، مجھ سے کسی قائل نے کہا: حضور یہ جہنم کے داروغہ مالک ہیں، آپ ان کو سلام کہیں۔ میں ان کی جانب متوجہ ہوا تو انہوں نے سلام میں مجھ سے پہل کی۔

اسی طرح امام نسائی نے حضرت انس بن مالک سے روایت کی ہے، حضرت انس بیان فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، پھر میں بیت المقدس میں داخل ہوا جہاں سارے انبیا علیہم السلام کو میرے اعزاز میں جمع کیا گیا تھا. جبرئیل نے مجھے امامت کے لیے آگے بڑھایا اور میں نے امامت کی۔

سفر معراج کی آگے کی تفصیل بھی امام نسائی نے بیان کی ہے۔ ابن کثیر سورۃ اسراء کی تفسیر میں حدیث معراج کے سلسلے میں بہت سی روایات بیان کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

" والحق انه عليه السلام اسرى به يقظة لا مناما من مكة الى بيت المقدس ۔ ثم قال ثم هبط الى بيت المقدس و هبط معه الانبياء فصلى بهم فيه لما حانت الصلاة "(تفسیر ابن کثیر)

نبی ﷺ نے مکہ سے بیت المقدس تک کا سفر عام عالم بیداری میں فرمایا، نہ کہ خواب میں۔ پھر ابن کثیر فرماتے ہیں۔ پھر سرکار ﷺ بیت المقدس پہنچے اور دیگر انبیا بھی جلوہ گر ہوئے، اور امام الانبیاء نے مسجد اقصیٰ میں ان کی امامت فرمائی۔

بخاری و مسلم و نسائی کی حدیثوں سے درج ذیل باتیں ثابت ہوئیں۔

(1) نبی کریم ﷺ کے ساتھ آسمانوں میں انبیائے کرام کی ملاقات بخاری کی روایت سے ثابت ہوئی۔

(2) مختلف مقامات پر انبیائے کرام علیہم السلام کی ملاقات اور بیت المقدس میں سید الانبیاء کی امامت فرمانا حدیث مسلم سے ظاہر ہوا۔

(3) سرور کائنات ﷺ کا تمام انبیا سے ملاقات کرنا اور بیت المقدس میں ان کی امامت فرمانا نسائی کی حدیث سے واضح ہوا۔

(4) امام بیہقی ان احادیث کی روشنی میں فرماتے ہیں کہ یہ ساری حدیثیں صحیح ہیں اور ان میں کسی طرح کا اختلاف و تعارض نہیں۔ کیونکہ نبی کائنات ﷺ نے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں، پھر حضرت موسیٰ اور دیگر انبیا کو بیت المقدس لایا گیا۔ حضور نے انہیں دیگر انبیا کے ساتھ بیت المقدس میں پایا، پھر انہیں آسمانوں میں لے جایا گیا۔ حضور نے ان حضرات کو آسمانوں پر بھی دیکھا، جیسا کہ احادیث میں مذکور ہے۔ مزید امام بیہقی نے انہیں حدیثوں سے دلیل قائم کرتے ہوئے فرمایا: "و فی کل ذلک دلالة علی حیاتھم "(حیاۃ الانبیاء ص22)

یہ سبھی حدیثیں صاف طور پر انبیا کی حیات پر دلالت کرتی ہیں۔

بنظر غائر دیکھنے کے بعد یہ بھی واضح ہو رہا ہے کہ مذکورہ حدیثیں نہ صرف حیات انبیا پر دلالت کرتی ہیں، بلکہ اس حقیقت پر بھی دلالت کرتی ہیں کہ انبیاء اکرام کی موجودہ زندگی توانائی اور فضیلت میں ان کی دنیاوی زندگی سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ کیونکہ انبیاء اکرام کا متعدد مقامات پر پایا جانا، پھر بیت المقدس میں تشریف لے جانا، پھر مختلف آسمانوں میں حاضر ہونا، وہ بھی نہایت کم وقت میں انتہائی سرعت کے ساتھ، اس بات کا بین ثبوت ہے کہ ان کی موجودہ زندگی ان کی دنیاوی زندگی سے کہیں زیادہ ارفع و اعلیٰ ہے۔ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے حدیث معراج کی روایت کی یا اس کو سنا، ان کا عقیدہ تھا کہ انبیاء اکرام علیہم السلام حقیقی جسمانی حیات کے ساتھ زندہ ہیں۔ انہیں بداہتاً معلوم تھا کہ رکوع و سجدے والی نماز کے لیے زندہ جسم کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ سیدِ کائنات ﷺ کا آسمانوں پر جلوہ گر ہونا اور آسمانوں پر انبیاء اکرام سے ملاقاتوں کا سلسلہ، یہ سب کچھ جسمانی تھا، نہ کہ روحانی۔ اسی لیے حدیث معراج سے دلیل قائم کرنے والے بے شمار ائمہ کرام، محدثین عظام، اور علمائے اسلام کی مقدس جماعت کے اقوال صفحات تاریخ کی زینت ہیں۔

اختصار کے پیش نظر صرف چند اساطین امت کے کلمات طیبات قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں۔

(1) ایک، امام بیہقی جو غالباً سب سے پہلے محدث ہیں جنہوں نے حیات انبیا پر قلم اٹھایا، وہ اپنی کتاب "حیاۃ الانبیاء" میں رقم طراز ہیں۔ "بلا شبہ سید کائنات ﷺ نے حضرت موسیٰ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں نماز ادا کر رہے ہیں، پھر سارے انبیا کے ساتھ بیت المقدس میں حضرت موسیٰ کو دیکھا، پھر ان کو اور دیگر انبیا کو آسمانوں میں دیکھا۔ بے شک اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

(2)علامہ ابن قیم اپنی معرکتہ الآراء کتاب "الروح" میں فرماتے ہیں: صحیح حدیث سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے شب معراج حضرت موسیٰ کو دیکھا کہ وہ اپنی قبر میں کھڑے نماز ادا کر رہے ہیں۔(الروح ص74)

گویا ابن قیم ان الفاظ حدیث سے حیات انبیا کا اثبات فرما رہے ہیں۔

(3) امام عبدالوہاب شعرانی تصریح فرماتے ہیں: سید کائنات ﷺ نے مطلقاً فرمایا کہ میں نے سفر معراج میں حضرت آدم، حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کو دیکھا۔ یہ نہیں فرمایا کہ حضرت آدم و حضرت موسیٰ کی روح کو دیکھا، اس سے ظاہر ہے کہ حضور نے آسمان میں حضرت موسیٰ کی طرف مراجعت کی جبکہ حضرت موسیٰ بعینہ زمین پر اپنی قبر میں بھی موجود تھے۔(الیواقیت والجواھر ج2ص36)

یعنی آقائے کائنات ﷺ نے حضرت آدم، حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہم السلام کو حقیقتاً ان کے جسموں کے ساتھ مختلف مقامات پر دیکھا۔ کتنی عظیم ہے انبیا علیہم السلام کی حیات مبارکہ کہ زمین کے مختلف حصوں میں، بیت المقدس میں اور آسمانوں کے مختلف حصوں میں جلوہ نما ہوتے ہیں۔فسبحان اللہ العظیم

(4)امام جلال الدین سیوطی، شیخ بدرالدین ابن الصاحب کی تصنیف "حیات انبیا" سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: یہ حدیث صاف لفظوں میں ثابت کرتی ہے کہ حضرت موسیٰ اپنی قبر میں زندہ ہیں کیونکہ نماز پڑھنا، قیام کرنا، اس قسم کے دوسرے افعال یہ سب جسم کی صفات ہیں روح کی نہیں۔ نیز قبر کی تخصیص بھی اس پر واضح دلیل ہے، کیونکہ مذکورہ چیزیں اگر روح کی صفت ہوتیں تو پھر قبر کو خاص کرنے کی کوئی حاجت نہیں۔

یہ دونوں عظیم عالم امام سیوطی جن کا شمار مجددین میں بھی ہے اور علامہ بدرالدین دونوں متفق ہیں کہ انبیاء اکرام علیہم السلام اپنے اجسام طیبہ کے ساتھ زندہ ہیں۔

(5)علامہ محمد بن یوسف صالحی شامی فرماتے ہیں: علامہ جمال الدین محمود بن جملہ نے فرمایا: حدیث معراج حضرت موسیٰ کی حیات کو صاف طور پر ثابت کرتی ہے کیونکہ ان کا نماز پڑھنا، قیام کرنا اور اس طرح کی دوسری صفات صرف روح کی نہیں بلکہ روح مع جسم کی صفات ہیں۔ اس لیے کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنا جسم میں روح کو لوٹائے بغیر ممکن نہیں۔ یہ انبیا کا عظیم اعزاز ہے کہ رب کریم ان کی ارواح مقدسہ کو ان کے اجسام مبارکہ میں واپس کر کے ان کو دائمی حیات سے نوازدیتا ہے۔ پھر چونکہ ان کی قبر کشادہ کر دی جاتی ہے اس لیے بعد وفات بھی ان کی عبادت کا سلسلہ جاری رہتا ہے اور اس رؤیت سے آنکھ کا دیکھنا مقصود ہے کیونکہ اہل سنت کا مذہب یہ ہے کہ معراج جسمانی تھی نہ کہ روحانی۔

(6)حافظ عبدالغنی نابلسی صاحب "عمدہ" سے کسی نے سوال کیا: هل صلى بأجسادهم أم بأرواحهم ؟۔ تو انہوں نے جواب دیا کہ جو لوگ حدیث رسول ﷺ کو دلیل مانتے ہیں، ان کا مذہب یہ ہے کہ شب معراج نبی کائنات ﷺ کو ان کا رب حالت بیداری میں جسم و روح کے ساتھ لے گیا۔ عرش اعظم، بلکہ قاب قوسین تک لے گیا۔ اب اعلیٰ کی شان اعلیٰ ہے کہ وہ آپ کو ان مقامات علیا تک لے گیا۔

یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء اکرام کی امامت فرمائی۔ تو ان اجسام مبارکہ کے ساتھ نماز پڑھائی۔ مختلف علما عبا قرہ نے تفسیر فرمائی ہے کہ واقعہ معراج احادیث صحیحہ متواترہ سے ثابت ہے۔ تو یہ بھی ثابت ہوا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کی حیات طیبہ بھی احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔

ائمہ اسلام کی رائیں

(1) حافظ امام بیہقی اپنی کتاب "الاعتقاد" میں فرماتے ہیں: انبیاء اکرام کی ارواح مبارکہ قبض کے بعد لوٹا دی گئی ہیں۔ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں جیسے شہداء اور ہمارے آقا ﷺ نے شب معراج انبیاء اکرام کی جماعت کا مشاہدہ کیا اور سارے انبیا کی امامت فرمائی۔ بے شک رب تعالیٰ نے حضرت انبیا کو دائمی حیات سے نوازا ہے۔

(2) ابن حجر عسقلانی نے بڑے واضح الفاظ میں فرمایا: **ان حیاته ﷺ فی القبر لا یعقبها موت بل یستمر حیاً والأنبیاء أحیا فی قبورهم**۔ (فتح الباری ج 7 ص 21)

قبر میں آقا ﷺ کو جو حیات حاصل ہے اس پر کبھی موت طاری نہیں ہو گی بلکہ ان کی حیات قائم و دائم ہے اور دیگر انبیا بھی اپنی قبروں میں زندہ ہیں۔

(3) حافظ ابن کثیر اپنا عقیدہ رقم فرماتے ہیں: علما نے فرمایا: قبر رسول ﷺ کے پاس آواز بلند کرنا اب بھی ویسے ہی مکروہ ہے جیسے آپ کی ظاہری حیات میں تھا۔ کیونکہ حضور ﷺ قبر میں زندہ ہونے کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے محترم و مکرم ہیں۔

(4) امام تاج الدین سبکی اپنے عقیدے کی وضاحت فرماتے ہیں: ہمارا عقیدہ ہے کہ انبیاء اکرام اپنی اپنی قبروں میں زندہ ہیں پھر ان کی موت کا کیا معنی؟ اور ہم اہل سنت کے نبی محمد ﷺ اپنی قبر میں زندہ ہیں۔

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز فرماتے ہیں:

تو زندہ ہے واللہ! تو زندہ ہے واللہ!
مِرے چشمِ عالَم سے چھپ جانے والے

انبیا کو بھی اجل آنی ہے
مگر ایسی کہ فقط آنی ہے

پھر اُسی آن کے بعد اُن کی حیات
مثل سابق وہی جسمانی ہے

امام احمد رضا سے کسی نے سوال کیا کہ کیا نماز کی فرضیت خبر واحد سے ثابت ہے؟ امام نے جواب دیا نہیں بلکہ صحیح ہے بخاری و مسلم وغیرہ کی احادیث متواترہ سے ثابت ہے۔ (فتاوی رضویہ)



خیر القرون کا منہج اور امت کی فکری وحدت

متفرقات

از: مولانا عقیل اشہر، بیگوسرائے

انسانی تاریخ کے اوراق کا عمیق مطالعہ اس حقیقت کو روزِ روشن کی طرح عیاں کرتا ہے کہ اختلاف، تنوع اور فکری تفاوت بنی نوع انسان کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ کائنات کا حسن اس کے تنوع میں مضمر ہے، اور انسانی عقل چونکہ مختلف زاویوں سے سوچنے کی صلاحیت رکھتی ہے، اس لیے آراء کا تنوع کوئی حادثاتی یا غیر طبعی امر نہیں بلکہ مشیّتِ ایزدی کا حصہ ہے۔ تاہم، جب یہ فکری تفاوت کسی مرکزِ اعتدال سے محروم ہو جاتا ہے تو اختلاف، انتشار اور تخریب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا ایک بنیادی مقصد اسی فکری انتشار کو اعتدال، توازن اور وحدت کے سانچے میں ڈھالنا رہا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر سید الانبیاء، خاتم النبیین ﷺ تک، ہر نبی نے انسانیت کو ایک مشترک کلمے اور ایک ربِ واحد کی بندگی پر جمع کرنے کی دعوت دی۔ اس دعوت کا مقصود کبھی یہ نہیں رہا کہ انسانوں کی طبعی، نفسیاتی اور عقلی انفرادیت کو ختم کر کے انہیں روبوٹ نما مشینی وجود بنا دیا جائے؛ بلکہ مقصود یہ تھا کہ افکار کے تنوع کو ایک مشترک اصول اور وحیِ الٰہی کی مرکزیت کے تابع کر دیا جائے۔ امتِ مسلمہ کی فکری وحدت کا مفہوم بھی ہرگز یہ نہیں کہ ہر ذی شعور فرد کی رائے، ذوق اور زاویۂ نگاہ من و عن ایک جیسا ہو جائے۔ کہ یہ تو نہ ممکن ہے اور نہ ہی مطلوب بلکہ فکری وحدت سے مراد یہ ہے کہ امت کے تمام طبقات اصولوں، مقاصدِ شریعت، اور کتاب و سنت کی بالادستی پر کامل اور غیر متزلزل اجماع رکھیں۔ فروعی اور اجتہادی مسائل میں اختلاف کے باوجود دلوں کا جڑا رہنا، اور ایک دوسرے کے لیے احترام و وسعتِ ظرف کا پایا جانا ہی دراصل وہ فکری وحدت ہے جس کی بنیاد خیر القرون میں رکھی گئی۔ قرآنِ کریم، جو انسانیت کے لیے آخری اور کامل صحیفۂ ہدایت ہے، اختلاف اور تفرقے کے درمیان ایک نہایت واضح اور نازک خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ قرآن مجید نے تنوع کو اللہ کی نشانی اور انسانی طبع کا حصہ قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری

تعالیٰ ہے: ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ أُمَّةً وَاحِدَةً وَلَا يَزَالُونَ مُخْتَلِفِينَ﴾ ترجمہ: اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام لوگوں کو ایک ہی امت بنا دیتا، اور وہ ہمیشہ اختلاف کرتے رہیں گے۔

یہ آیتِ کریمہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ اختلافِ آراء ایک فطری امر ہے۔ لیکن جہاں قرآن مجید اختلاف کو ایک طبعی حقیقت تسلیم کرتا ہے، وہیں وہ حق سے انحراف، ہوائے نفس کی پیروی اور تفرقہ بازی کو قطعی طور پر مذموم قرار دیتا ہے۔ تفرقہ اس اختلاف کا نام ہے جو دلوں میں بغض، عداوت اور گروہ بندی کو جنم دے کر امت کے شیرازے کو بکھیر دے۔ اسی لیے خالقِ کائنات نے پوری شدت کے ساتھ تفرقے سے منع فرمایا اور اعتصام بحبل اللہ (اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے) کا حکم دیا: ﴿وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُم بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا﴾

اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اور اپنے اوپر اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی بھائی بن گئے۔

یہاں حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے مراد قرآن، دینِ اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، جو امت کی وحدت کا محور ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اجتماعیت، اخوت اور شوریٰ وہ اساسی ستون ہیں جن پر امتِ مسلمہ کی عمارت قائم ہے۔ ایک طرف قرآن یہ اعلان کرتا ہے کہ ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾ (بلاشبہ تمام مومن آپس میں بھائی ہیں)، اور دوسری طرف اجتماعی اور فکری معاملات کو طے کرنے کے لیے ﴿وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ﴾ (اور ان کے معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں) کا سنہری اصول عطا کرتا ہے۔ شوریٰ کا تصور ہی اس بات کا متقاضی ہے کہ مختلف آراء موجود ہوں، ان پر بحث و تمحیص ہو، اور پھر ایک متفقہ یا اکثریتی فیصلے تک پہنچا جائے، جس کے بعد سب کے دل اس فیصلے پر مطمئن ہوں۔

قرآنی تعلیمات کا یہ عملی اور کامل ترین نمونہ ہمیں رسول اللہ ﷺ کے عہدِ مبارک میں نظر آتا ہے۔ آپ ﷺ نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی ایسی فکری اور اخلاقی تربیت فرمائی کہ انہوں نے دین کے فہم میں کامل آزادیِ فکر کا مظاہرہ کیا، مگر اس آزادی کو کبھی انتشار کا سبب نہیں بننے دیا۔ صحابہ کرام کے درمیان فہمِ نصوص اور اجتہادی مسائل میں بیسیوں مقامات پر اختلاف ہوا، لیکن یہ اختلاف ان کی باہمی محبت، اخوت اور وحدت کی راہ میں کبھی حائل نہیں ہوا۔ اس کی سب سے روشن اور شہرۂ آفاق مثال غزوۂ خندق کے فوراً بعد بنو قریظہ کی طرف روانگی کا واقعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا: "لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدٌ العَصْرَ إِلَّا فِي بَنِي قُرَيْظَةَ" ترجمہ: تم میں سے کوئی شخص عصر کی نماز نہ پڑھے مگر بنو قریظہ پہنچ کر۔

راستے میں نمازِ عصر کا وقت تنگ ہونے لگا۔ اب صحابہ کرام کے درمیان دو مختلف آراء پیدا ہو گئیں۔ ایک گروہ نے الفاظ کے ظاہری مفہوم کو لیا اور کہا کہ ہم نماز وہیں جا کر پڑھیں گے، خواہ وقت گزر ہی کیوں نہ جائے۔ دوسرے گروہ نے اس فرمان کے مقصد (علت) پر غور کیا اور سمجھا کہ آپ ﷺ کا مقصود جلدی سفر طے کرنے کی تاکید تھا، نہ کہ نماز کو قضا کرنا، چنانچہ انہوں نے راستے میں ہی نماز ادا کر لی۔ جب یہ معاملہ بارگاہِ رسالت ﷺ میں پیش ہوا تو آپ ﷺ نے دونوں میں سے کسی بھی گروہ پر عتاب نہیں فرمایا۔ اس واقعے میں امت کے لیے ایک عظیم اصولی سبق پوشیدہ ہے کہ اگر نیت درست ہو، دلائل شرعیہ پر اعتماد ہو اور اختلاف فہم و بصیرت کی بنیاد پر ہو، تو دونوں آراء کے حاملین نہ صرف معذور ہیں بلکہ مأجور (اجر پانے والے) ہیں۔

اسی طرح غزوۂ بدر کے قیدیوں کے معاملے میں صحابۂ کرام کا اختلاف تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب ہے۔ ایک طرف حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، جو ان کی فطری نرمی، صلہ رحمی اور عفو و درگزر پر مبنی تھی، کہ ان قیدیوں سے فدیہ لے کر انہیں چھوڑ دیا جائے تاکہ یہ مال مسلمانوں کی قوت کا باعث بنے اور شاید اللہ انہیں ہدایت نصیب فرما دے۔ دوسری طرف حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی رائے تھی، جو ان کی حقانیت، غیرتِ دینی اور کفر کے استیصال کے جذبے سے عبارت تھی، کہ ان سب کی گردنیں اڑا دی جائیں تاکہ کفر کی کمر ٹوٹ جائے۔ یہ ایک بہت بڑا اسٹریٹجک اور ریاستی فیصلہ تھا جس میں دو جلیل القدر صحابہ کے درمیان واضح اختلاف تھا، لیکن اس اختلاف نے ان کے درمیان باہمی احترام کو کم نہیں کیا۔ بعد ازاں وحیِ الٰہی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تائید فرمائی، لیکن حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کی نیت اور خلوص پر کوئی حرف نہیں آیا۔

حجِ تمتع کے جواز اور افضلیت پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، نیز حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کے درمیان طویل علمی مباحث اور اختلافات کتبِ احادیث و تاریخ میں محفوظ ہیں۔ لیکن کیا ان علمی اور فقہی اختلافات کی وجہ سے کبھی کسی صحابی نے دوسرے صحابی کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کیا؟ کیا کبھی کسی نے دوسرے کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دیا؟ ہرگز نہیں۔ ان کا اختلاف عقول کا اختلاف تھا، قلوب کا نہیں۔

اس عہدِ زریں، جس کی فضیلت خود زبانِ رسالت مآب ﷺ نے بیان فرمائی، کا بغور مطالعہ ہر دور کے محقق پر یہ حقیقت آشکار کرتا ہے کہ علمی دیانت کیا ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ۔ سب سے بہترین لوگ میرے زمانے کے ہیں، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے۔

یہ تین ادوار—صحابہ، تابعین اور تبع تابعین—مجموعی طور پر 'خیر القرون' کہلاتے ہیں۔ خیر القرون کا منہج دراصل وہ کسوٹی ہے جس پر بعد میں آنے والی ہر فکری، کلامی اور فقہی تحریک کو پرکھا جائے گا۔ اس منہج کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کتاب و سنت کو غیر متنازعہ بالادستی حاصل تھی، لیکن نصوص کی تشریح میں انسانی عقل اور اجتہاد کو اس کا جائز مقام دیا گیا تھا۔ اس دور میں جب کوئی نیا مسئلہ درپیش ہوتا تو اکابر صحابہ قرآن و سنت کی طرف رجوع کرتے، اگر وہاں صریح حکم نہ ملتا تو اپنی بصیرت سے اجتہاد کرتے، اور اگر کسی دوسرے کا اجتہاد ان کی نظر میں زیادہ قوی ہوتا تو بلا تکلف اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، جن کی جلالتِ علمی اور رعبِ ایمانی سے تاریخ واقف ہے، اکثر مسائل میں حضرت علی المرتضیٰ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم سے مشورہ کرتے اور بسا اوقات اپنی رائے ترک کر کے ان کی رائے کو قبول کر لیتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، جو کوفہ میں فقہ کے سب سے بڑے معلم تھے، بعض مسائل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اختلاف رکھتے تھے، لیکن جب ان سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں پوچھا تو فرمایا: "اگر عمر کا علم ترازو کے ایک پلڑے میں رکھا جائے اور روئے زمین کے لوگوں کا علم دوسرے پلڑے میں، تو عمر کا علم بھاری رہے گا۔" یہ تھا وہ ظرف، وہ علمی وقار اور وہ فکری وحدت، جو اختلافِ رائے کو تکفیر اور تفسیق کی آلودگیوں سے محفوظ رکھتی تھی۔

ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا، جو علم، تفقہ اور حدیث میں بلند ترین مقام رکھتی تھیں، بسا اوقات حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے فہم پر علمی تنقید فرماتی تھیں (جیسا کہ علامہ بدر الدین زرکشی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب 'الإجابة لإيراد ما استدركته عائشة على الصحابة' میں جمع کیا ہے)، مگر اس علمی استدراک میں کمال درجہ احترام اور وقار ملحوظ رہتا۔ صحابہ کا یہ اختلاف سراسر 'اختلافِ تنوع' تھا، جس نے اسلامی فقہ اور قانون کو وسعت، لچک اور آفاقیت بخشی۔

جب ہم خیر القرون کے دوسرے اور تیسرے طبقے، یعنی تابعین اور ائمہ مجتہدین (تبع تابعین) کے دور کی طرف نظر دوڑاتے ہیں تو فکری وحدت اور علمی رواداری کا یہ تسلسل اور بھی زیادہ روشن ہو کر سامنے آتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں پھیل چکی تھیں، نئے تہذیبی، معاشرتی اور معاشی مسائل جنم لے رہے تھے، اور قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے حل کے لیے باقاعدہ فقہی مکاتبِ فکر (Schools of Jurisprudence) وجود میں آ رہے تھے۔ کوفہ میں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور مدینہ منورہ میں امام دار الہجرۃ امام مالک رحمہ اللہ، عالمِ اسلام کے دو عظیم علمی ستون تھے۔ ان دونوں کے طرزِ استدلال میں نمایاں فرق تھا۔ امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ 'مدرسۃ الرائے' کے سرخیل تھے جہاں قیاس اور استحسان کا استعمال غالب

تھا، جبکہ امام مالک رحمہ اللہ 'مدرسۃ الحدیث' اور اہلِ مدینہ کے تعامل کو حجت ماننے والوں کے پیشوا تھے۔ لیکن جب امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ مدینہ تشریف لائے اور امام مالک رحمہ اللہ سے ان کی ملاقات ہوئی، تو تاریخ گواہ ہے کہ دونوں کے درمیان جو علمی مباحثے ہوئے، وہ کمال درجے کی شائستگی اور ایک دوسرے کے علم کے اعتراف پر مبنی تھے۔ امام مالک رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے متعلق فرمایا: "میں نے ایک ایسا شخص دیکھا ہے کہ اگر وہ دعویٰ کرے کہ یہ ستون سونے کا ہے، تو اپنے دلائل سے اسے ثابت کر دے گا"۔

امام اعظم رحمہ اللہ کے دو جلیل القدر تلامذہ، امام ابو یوسف رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ، نے اپنے استادِ محترم سے فقہ کے دو تہائی مسائل میں اختلاف کیا، لیکن یہ اختلاف ان کی نظر میں استاد کی عظمت میں کسی کمی کا باعث نہ تھا۔ یہ ایک خالص علمی اور تحقیقی کاوش تھی۔ جب امام شافعی رحمہ اللہ، جنہیں اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی ذہانت اور استنباط کا ملکہ عطا فرمایا تھا، امام مالک رحمہ اللہ کی شاگردی اختیار کرنے کے بعد عراق تشریف لائے اور وہاں فقہِ حنفی کے امام، امام محمد بن حسن الشیبانی رحمہ اللہ سے تبادلۂ خیال کیا، تو دونوں مکاتبِ فکر کی خوبیاں سمیٹ کر اپنا ایک نیا منہج (فقہ شافعی) مدون کیا۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا امام محمد رحمہ اللہ اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے بارے میں یہ قول آج بھی تاریخ کے ماتھے کا جھومر ہے: "تمام لوگ فقہ میں ابو حنیفہ کے عیال (محتاج) ہیں"۔

ان ائمہ کے نزدیک علم کسی کی جاگیر نہ تھا، اور نہ ہی ان کا مقصد اپنی ذات کی تکبیر یا اپنے مسلک کا تعصب تھا۔ ان کا مطمحِ نظر صرف اور صرف رضائے الٰہی اور حق کی تلاش تھی۔ امام شافعی رحمہ اللہ کا وہ مشہور اور سنہری مقولہ جو آج بھی ہر طالبِ علم اور محقق کے لیے مشعلِ راہ ہے، اسی وسیع النظری کی غمازی کرتا ہے: رأينا صواب يحتمل الخطأ، ورأي غيرنا خطأ يحتمل الصواب۔ یعنی: ہماری رائے درست ہے مگر اس میں غلطی کا احتمال موجود ہے، اور ہمارے غیر کی رائے [ہمارے نزدیک] غلط ہے مگر اس میں درستگی کا احتمال موجود ہے۔

یہ جملہ محض الفاظ کا مجموعہ نہیں، بلکہ ایک مکمل فکری منہج ہے جو تعصب، ہٹ دھرمی اور فکری جمود پر کاری ضرب لگاتا ہے۔ اسی طرح امام شافعیؒ کا یہ اعلان: إذا صح الحديث فهو مذهبي۔ یعنی جب کوئی صحیح حدیث ثابت ہو جائے، تو وہی میرا مذہب ہے۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان تمام ائمہ کے نزدیک اصل مرکز و محور وحی اور حدیثِ رسول ﷺ تھی، شخصیات نہیں۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ، جن کی استقامت نے خلقِ قرآن کے فتنے میں امت کو بکھرنے سے بچایا، امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد

بھی تھے اور امام بھی۔ ان کا اپنے استاد کے بارے میں احترام اس قدر تھا کہ وہ اپنی دعاؤں میں امام شافعی رحمہ اللہ کو یاد رکھا کرتے تھے۔ ائمۂ اربعہ اور محدثینِ عظام کے مابین مسائل میں اختلافِ دلائل کی بنا پر ضرور تھا، مگر انہوں نے کبھی ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی، کبھی مساجد الگ نہیں کیں، اور کبھی امت کو گروہوں میں تقسیم کرنے کی ترغیب نہیں دی۔

ان حقائق اور تاریخی شواہد کی روشنی میں جب ہم آج کے دور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو دل خون کے آنسو روتا ہے۔ معاصر دور میں امتِ مسلمہ جس شدید فکری انتشار، فرقہ واریت اور عدم برداشت کا شکار ہے، اس کی بنیادی وجہ اسی 'منہجِ خیر القرون' سے انحراف ہے۔ آج ہم نے اختلافِ رائے کو، جو علمی ارتقاء کی سیڑھی تھا، عناد اور دشمنی کا آلہ بنا لیا ہے۔ فروعی اور جزوی مسائل کو بنیاد بنا کر کفر اور شرک کے فتوے صادر کرنا، اپنی رائے کو حتمی اور قطعی (Absolute) سمجھ کر دوسروں کو دائرۂ اسلام سے خارج سمجھنا، اور منبر و محراب سے لے کر سوشل میڈیا کے پلیٹ فارمز تک پر ایک دوسرے کے خلاف سوقیانہ زبان استعمال کرنا یہ سب اس زوال کی نشانیاں ہیں جو علمی بانجھ پن اور اخلاقی افلاس سے جنم لیتی ہیں۔

سوشل میڈیا اور جدید ذرائع ابلاغ نے جہاں معلومات کے حصول کو آسان بنایا ہے، وہیں اس نے "نیم حکیم خطرہ جان، نیم ملا خطرہ ایمان" کے مصداق، سطحی علم رکھنے والوں کو مفتی اور قاضی کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔ آج ہر شخص، جس نے نہ اصول پڑھے ہیں، نہ فقہ کی تاریخ جانی ہے، اور نہ ہی نصوص کے فہم کے لیے درکار شرائط سے واقفیت رکھتا ہے، وہ امت کے اکابرین پر تنقید اور فتوے بازی کو اپنا حق سمجھتا ہے۔ یہ فکری طوائف الملوکی اس لیے پیدا ہوئی کیونکہ ہم نے اختلاف کے آداب کو فراموش کر دیا ہے۔ ہم نے یہ بھلا دیا کہ صحابہ اور ائمہ کس طرح ایک دوسرے کی آراء کا احترام کرتے تھے، کس طرح وہ اپنے دلائل پیش کرنے کے بعد بھی مخالف کی نیت پر حملہ نہیں کرتے تھے۔

امتِ مسلمہ کو درپیش موجودہ سنگین چیلنجز — چاہے وہ عالمی استعمار کی یلغار ہو، الحاد اور لادینیت کا فتنہ ہو، یا اندرونی خلفشار — ان کا مقابلہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ہم دوبارہ اسی فکری وحدت کو حاصل نہ کر لیں جو خیر القرون کا طرۂ امتیاز تھی۔ اور یہ فکری وحدت مکتبی اختلافات کو مٹانے سے نہیں آئے گی؛ اختلافات تو رہیں گے کیونکہ انسانی عقول مختلف ہیں اور نصوص میں کئی معانی کی گنجائش موجود ہے۔ یہ وحدت اس وقت حاصل ہوگی جب ہم اختلاف کے آداب سیکھیں گے۔ جب ہم یہ تسلیم کریں گے کہ فروع میں اختلاف کے باوجود ہم ایک ہی رب کے بندے، ایک ہی نبی ﷺ کے امتی، اور ایک ہی کتاب کے ماننے والے ہیں۔

وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کہ ہم فقہی اور مشربی اختلافات کو علمی مجالس اور کتب تک محدود رکھیں اور عوام الناس کی سطح پر صرف وہ دین پیش کریں جو قلوب کو جوڑنے والا، اخلاق کو سنوارنے والا، اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے محبت پیدا کرنے والا ہو۔ علمائے کرام، محققین اور دانشوروں کا یہ اولین فریضہ ہے کہ وہ اپنے رویوں، اپنی تحریروں اور اپنی تقاریر سے اس وسعتِ ظرفی، تحمل، اور علمی اعتدال کا مظاہرہ کریں جو حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں تھا، جو امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ میں تھا۔

جب تک ہم فکری سطح پر اس منہج کی طرف نہیں لوٹتے جس میں دلیل کو انا پر، اور امت کے وسیع تر مفاد کو گروہی تعصب پر ترجیح دی گئی تھی، ہم من حیث الامت اسی ذلت و رسوائی کی اتھاہ گہرائیوں میں بھٹکتے رہیں گے۔ خیر القرون کا علمی وقار ہمیں یہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ حق کسی ایک شخصیت، کسی ایک گروہ، یا کسی ایک دور کی میراث نہیں، بلکہ حق اللہ کا وہ نور ہے جسے تلاش کرنے کی سعی، خلوصِ نیت کے ساتھ، ہر طالبِ علم کا فریضہ ہے۔ ہمیں آج ایک بار پھر اسی قرآنی دعوتِ اعتصام اور نبوی منہجِ اعتدال کو اپنانے کی ضرورت ہے تاکہ امت کی فکری وحدت محض ایک خوابِ شریں کے بجائے ایک زندہ اور پائندہ حقیقت کا روپ دھار سکے۔ اور یہی وہ واحد راستہ ہے جس پر چل کر یہ امت ایک بار پھر اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کے اس منصبِ جلیلہ پر فائز ہو سکتی ہے جس کے لیے خالقِ کائنات نے اسے "خیرِ امت" کے لقب سے سرفراز فرمایا تھا۔



ارتکازِ دولت کا عالمی بحران اور اسلامی معاشی اصولوں کی عصری معنویت

از: نبیل غزالی، شعبہ بزنس مینجمنٹ، نجم الدین اربکان یونیورسٹی، قونیہ، ترکی

متفرقات

اکیسویں صدی کا انسان جہاں ایک طرف تکنیکی اور سائنسی عروج کی ان دیکھی منازل طے کر رہا ہے اور خلا کی وسعتوں کو تسخیر کرنے کے دعوے دار ہے، وہیں دوسری جانب زمینی حقائق کا بغور جائزہ لیا جائے تو وہ ایک ایسے ہولناک معاشی بحران کی زد میں ہے جس نے انسانیت کی روح کو چھلنی کر دیا ہے۔ یہ بحران وسائل کی عدم دستیابی یا قلت کا نہیں ہے، بلکہ وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم اور ارتکازِ دولت (Concentration of Wealth) کا وہ عفریت ہے جس نے عالمی معیشت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام (Capitalism) نے اپنی پوری عمارت کی خشتِ اول ہی بے لگام منافع خوری، غیر منضبط مسابقت (Unregulated Competition) اور ہر قسم کی اخلاقی و سماجی قیود سے آزاد خالص انفرادی مفاد پر رکھی، جس کا حتمی اور منطقی نتیجہ یہ نکلا کہ آج دنیا کی معیشت چند مخصوص طبقات اور کثیر القومی کارپوریشنز (Multinational Corporations) کی لونڈی بن کر رہ گئی ہے۔ ایک محقق کی حیثیت سے جب ہم عصرِ حاضر کے معاشی ڈھانچے کا عمیق تجزیہ کرتے ہیں تو یہ تلخ حقیقت پوری شدت کے ساتھ آشکار ہوتی ہے کہ "ٹرکل ڈاؤن اکنامکس (Trickle-down Economics) " کا وہ دلفریب نظریہ، جس نے دنیا کو یہ دلاسہ دیا تھا کہ اوپر کی سطح پر جمع ہونے والی بے پناہ دولت رس رس کر نچلے اور پسماندہ طبقات تک خود بخود پہنچ جائے گی، محض ایک سراب اور معاشی دھوکہ ثابت ہوا ہے۔ اس نظام نے غریب کو مزید غریب اور امیر کو فرعون صفت بنا دیا ہے۔

کسی بھی مرض کی درست تشخیص اور اس کی ہلاکت خیزی کا اندازہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی شدت کو جدید اعداد وشمار (Empirical Data) کی کسوٹی پر نہ پرکھا جائے۔ عالمی بینک (World Bank)، آکسفیم (Oxfam) اور ورلڈ ان

اکویلیٹی لیب (World Inequality Lab) جیسی مستند بین الاقوامی تنظیموں کی حالیہ تحقیقی رپورٹس مروجہ معاشی نظام کے ماتھے پر کلنک کا نمایاں ترین ٹیکہ ہیں۔ آکسفیم کی چشم کشا رپورٹ "سروائیول آف دی رچیسٹ (Survival of the Richest)" کے مطابق، سال 2020 سے لے کر اب تک عالمی مندی میں پیدا ہونے والی 42 ٹریلین ڈالر کی نئی دولت کا قریباً 63 فیصد حصہ (یعنی دو تہائی) محض ایک فیصد امیر ترین اشرافیہ کی تجوریوں کی نذر ہو گیا ہے، جبکہ باقی ماندہ 99 فیصد انسانیت کے حصے میں اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر دولت آئی ہے۔ اس ظلم کی مزید تصدیق 'ورلڈ اِن اکویلیٹی رپورٹ' (World Inequality Report) کے ان لرزہ خیز اعداد و شمار سے ہوتی ہے جن کے مطابق دنیا کی غریب ترین پچاس فیصد آبادی کے پاس عالمی دولت کا بمشکل 2 فیصد حصہ ہے، جبکہ امیر ترین 10 فیصد افراد عالمی دولت کے 76 فیصد پر قابض ہو چکے ہیں۔ رپورٹ کا یہ ہوش ربا انکشاف بھی عالمی ضمیر کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے کہ دنیا کے چند امیر ترین افراد نے حالیہ عالمی بحرانوں کے دوران اپنی دولت کو دگنا کر لیا، جب کہ اسی عرصے میں دنیا کی 99 فیصد آبادی کی آمدنی (Income) میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔ دوسری جانب عالمی بینک کا 'گنی کوایفیشنٹ (Gini Coefficient)'، جو معاشی عدم مساوات (Economic Inequality) کو ماپنے کا ایک عالمگیر اور مستند پیمانہ ہے، یہ گواہی دے رہا ہے کہ کئی ممالک میں یہ اشاریہ 0.4 کی خطرناک حد کو عبور کر کے 0.5 اور اس سے بھی اوپر جا چکا ہے، جو کہ معاشی تباہی اور طبقاتی کشمکش کا واضح اعلان ہے۔ ایک طرف افریقہ اور ایشیا کے پسماندہ خطوں میں کروڑوں انسان خطِ غربت (Poverty Line) سے نیچے سسکتے ہوئے زندگی گزارنے پر مجبور ہیں، جنہیں دو وقت کی باعزت روٹی، بنیادی صحت اور تعلیم تک میسر نہیں، اور دوسری طرف چند کارپوریشنز کے اثاثے کئی خود مختار ریاستوں کی مجموعی قومی پیداوار (GDP) سے بھی تجاوز کر چکے ہیں۔ یہ صریح تضاد اس بات کی کھلی غمازی کرتا ہے کہ مروجہ معاشی نظام دولت پیدا کرنے کی مشین تو ضرور بن گیا ہے، لیکن اس کی منصفانہ تقسیم (Fair Distribution) کا کوئی بھی اخلاقی یا قانونی میکانزم اس کے پاس سرے سے موجود ہی نہیں۔

اس استحصالی صورتحال کے اسباب پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جدید سرمایہ دارانہ نظام جن بنیادی ستونوں پر استوار ہے، ان میں سود (Riba) کی لعنت، سٹے بازی (Speculation) اور ذخیرہ اندوزی پر مبنی اجارہ داری (Monopoly) سب سے نمایاں ہیں۔ ان عناصر نے معیشت کی رگوں میں دوڑتے ہوئے خون یعنی دولت کے فطری بہاؤ کو روک کر اسے ایک متعفن اور بند تالاب میں تبدیل کر دیا ہے۔ جب سرمایہ دار سود کے ذریعے بغیر کسی حقیقی تجارتی خطرے کے اپنا مال بڑھاتا ہے، تو وہ دراصل معاشرے کے غریب طبقے کی محنت کا خون چوستا ہے۔ اس کے برعکس، اسلامی فقہ اور معاشی فلسفہ 'احتکار' (Hoarding) کو سختی سے مسترد کرتا ہے اور اسے معاشی استحصال کے مترادف قرار دیتا ہے۔ احادیثِ مبارکہ میں ذخیرہ اندوزی کی جس صراحت کے ساتھ ممانعت آئی ہے، وہ آج کے اس معاشی مافیا پر براہ راست ضرب لگاتی ہے۔ رسولِ خدا صلی

اللہ علیہ وسلم کا واضح اور دوٹوک ارشادِ گرامی ہے کہ "لا یحتکر إلا خاطئ" (صحیح مسلم) یعنی ذخیرہ اندوزی نہیں کرتا مگر وہ جو گنہگار ہو۔ دورِ حاضر میں یہ احتکار محض گندم، کھجور یا جو کی بوریوں تک محدود نہیں رہا، بلکہ یہ دانشورانہ املاک کے قوانین (Intellectual Property Rights)، زندگی بچانے والی ادویات پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے پیٹنٹ (Patents)، اور عالمی سپلائی چین (Global Supply Chain) پر مکمل اجارہ داری کی صورت میں ایک عالمی وبا کی ہولناک شکل اختیار کر چکا ہے۔ امامِ اہلِ سنت، مجددِ دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضلِ بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مایہ ناز فتاویٰ، 'فتاویٰ رضویہ' میں احتکار اور مصنوعی گرانی (Artificial Inflation) پیدا کرنے والوں کا سخت رد فرمایا ہے۔ آپ واضح فرماتے ہیں کہ عوام الناس کی بنیادی ضروریات کی فراہمی کو جان بوجھ کر روکنا تاکہ منڈی میں قلت پیدا ہو اور ہوش ربا منافع کمایا جا سکے، شریعتِ مطہرہ میں صریحاً ناجائز اور حرام ہے۔ آپ کا یہ فقہی استنباط آج کے ان سرمایہ دارانہ مافیاز پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے جو اربوں ڈالر کا غلہ محض اس لیے سمندر برد کر دیتے ہیں یا منڈیوں تک نہیں پہنچنے دیتے تاکہ عالمی مارکیٹ میں ان کی قیمتیں گرنے نہ پائیں۔ یہ مصنوعی قلت پیدا کر کے ظالمانہ منافع کمانے کی وہی قدیم استحصالی ذہنیت ہے جس کا سدِباب اسلام نے چودہ سو سال قبل ہی کر دیا تھا۔

ایسے گھٹن زدہ ماحول میں ایک منصفانہ، متوازن اور پائیدار معاشی نظام کی تلاش وقت کی اہم ترین ضرورت بن چکی ہے، اور بعینہٖ یہیں سے اسلامی معاشی اصولوں کی وہ عصری معنویت ابھر کر سامنے آتی ہے، جس کی بنیاد حرص و ہوس کے بجائے 'عدلِ تقسیمی (Distributive Justice)' پر استوار ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت کا طرہ امتیاز اور اس کا سب سے بڑا حسن یہ ہے کہ وہ مادیت کو روحانیت، اخلاقیات اور جوابدہی کے تصور سے جدا نہیں کرتا۔ قرآن حکیم نے دولت کو سمیٹ کر اور دبا کر رکھنے کے عمل کو 'کنز (Hoarding of Wealth)' سے تعبیر کیا ہے اور اس پر سخت ترین وعید سنائی ہے۔ سورۃ التوبہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: "وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" (اور وہ جو سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دو)۔ اس آیت میں لفظ 'يَكْنِزُونَ' دراصل اسی جامد معیشت (Stagnant Economy) کے تابوت میں آخری کیل ہے جسے آج کا استحصالی نظام فروغ دے رہا ہے۔ اسلام نجی ملکیت (Private Property) کا قائل تو ہے اور حلال طریقے سے محنت کر کے دولت کمانے کی بھرپور حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے، لیکن وہ اس ملکیت کو انسان کا مطلق حق تسلیم نہیں کرتا، بلکہ اسے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ ایک 'امانت' قرار دیتا ہے۔ قرآنِ حکیم نے معاشی عدل کا جو شاہکار اصول پیش کیا ہے، وہ آج کے تمام جدید معاشی نظریات، خواہ وہ کارپوریٹ سماجی ذمہ داری (Corporate Social Responsibility) ہو یا سوشلزم کی مسلط کردہ غیر فطری مساوات، ان سب پر بھاری اور فائق ہے۔ سورۃ الحشر میں مالِ فے کے مصارف اور اس کی تقسیم کی

حکمت بیان کرتے ہوئے باری تعالیٰ نے ایک ایسا آفاقی اور ابدی اصول وضع فرمادیا جو تاقیامت ہر منصفانہ معاشی پالیسی کی روح ہونا چاہیے؛ ارشاد ہوتا ہے: "كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ" (تاکہ یہ دولت صرف تمہارے مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتی رہے)۔ اس ایک آیتِ مبارکہ کے اندر مروجہ عالمی معاشی عدم مساوات کے بطلان اور اس کے مستقل علاج کی پوری دلیل موجود ہے۔ قرآنی اصطلاح "دُولَةً" اس بات کی گہری نشاندہی کرتی ہے کہ معیشت کا خون ہر حال میں معاشرے کی رگوں میں گردش (Circulation) کرتا رہنا چاہیے، اگر یہ خون جسم کے کسی ایک حصے میں جمع ہو جائے اور باقی اعضاء تک نہ پہنچے تو یہ پورے جسم کو معاشی فالج (Economic Paralysis) کا شکار کر دیتا ہے۔

آج کے مغربی معاشی مفکرین اپنے مقالوں میں جس بات کا رونا رو رہے ہیں کہ جدید ٹیکس کا نظام امراء کو مزید امیر ہونے سے روکنے میں مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے، کیونکہ یہ سرمایہ دار ٹیکس ہیونز (Tax Havens) اور قانونی شگافوں (Legal Loopholes) کا استعمال کر کے اپنی دولت بچا لیتے ہیں، وہاں اسلام کا نظامِ زکوٰۃ، عشر اور صدقاتِ واجبہ ایک خاموش مگر انتہائی مؤثر انقلابی کردار ادا کرتا ہے۔ جدید دور کا ٹیکس سسٹم عموماً انسان کی آمدنی پر لگایا جاتا ہے جس کا بالواسطہ بوجھ بالآخر غریب کی کمر توڑتا ہے، جبکہ اسلام کا نظامِ زکوٰۃ براہِ راست انسان کے محفوظ سرمائے اور جامد اثاثوں (Idle Assets) پر ضرب لگاتا ہے۔ فقیہِ اعظم، صدر الشریعہ مفتی امجد علی اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اپنی مایہ ناز تصنیف 'بہارِ شریعت' میں زکوٰۃ کی فرضیت اور اس کی روحانی و معاشی حکمتوں کو بیان کرتے ہوئے اس بات پر زور دیتے ہیں کہ زکوٰۃ محض کوئی روایتی ٹیکس نہیں بلکہ مال کا میل اور معاشرے کے غریبوں کا وہ حتمی حق ہے جس کی ادائیگی کے بغیر انسان کا سرمایہ پاک ہی نہیں ہو سکتا۔ جب اڑھائی فیصد کے حساب سے ہر سال روکی گئی دولت پر زکوٰۃ واجب ہوتی ہے، تو سرمایہ دار اس سرمائے کو گردش میں لانے اور اسے پیداواری سرگرمیوں (Productive Activities) میں لگانے پر مجبور ہو جاتا ہے تاکہ اس کا مال محض زکوٰۃ کی کٹوتی کی نذر ہو کر ختم نہ ہو جائے۔ یہ فقہی اصول خود بخود معاشرے میں روزگار کے بے شمار مواقع (Employment Opportunities) پیدا کرتا ہے اور عام آدمی کی قوتِ خرید (Purchasing Power) میں اضافہ کر کے معیشت کے پہیے کو رواں رکھتا ہے۔ خلیفہِ راشد سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا وہ مشہور اور بصیرت افروز فرمان دورِ حاضر کی میکرو اکنامک (Macroeconomic) پالیسیوں کے لیے ایک روشن مینارہِ نور ہے، جس میں آپ نے یتیم کے مال کے ولی کو سخت تاکید کرتے ہوئے حکم دیا تھا کہ "اتجروا في أموال اليتامى لا تأكلها الزكاة" (سنن الدار قطنی) یعنی یتیموں کے مال کو تجارت میں لگاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے زکوٰۃ ہی کھا جائے۔ یہ محض ایک وقتی ہدایت نہیں تھی، بلکہ معیشت کا وہ عظیم ترین کلیہ تھا جو بتاتا ہے کہ سرمائے کو منجمد رکھنا کسی بھی قوم کی معاشی موت کا پروانہ ہے۔

مزید بر آں، جب ہم اسلامی معاشی ڈھانچے میں مشارکہ (Partnership) اور مضاربہ (Mudarabah) کے اصولوں کا تقابلی جائزہ مروجہ کمرشل بینکنگ (Commercial Banking) سے کرتے ہیں، تو یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اسلام قرض کی بنیاد پر معیشت چلانے (Debt-based Economy) کے بجائے نفع اور نقصان کی حقیقی شراکت داری (Equity-based Financing) پر یقین رکھتا ہے۔ موجودہ نظام سود پر قرض دے کر خطرے کا سارا بوجھ غریب اور درمیانے درجے کے کاروباری شخص پر ڈال دیتا ہے اور خود محفوظ منافع کماتا ہے، جس کا حتمی نقصان معاشرے کو مہنگائی کی صورت میں بھگتنا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس، مضاربہ میں سرمایہ دار کا سرمایہ اور محنت کش کی صلاحیت دونوں ایک دوسرے کے شراکت دار بنتے ہیں، جس سے معیشت میں حقیقی ہمدردی، باہمی تعاون اور پائیدار ترقی (Sustainable Development) جنم لیتی ہے۔ یہ وہ ٹھوس، عالمانہ اور فطری معاشی خاکہ ہے جو عصری معاشی الجھنوں کا واحد اور حتمی حل پیش کرتا ہے۔ جب تک دنیا دولت کے اس ظالمانہ ارتکاز کو توڑ کر اسلامی عدلِ تقسیمی کے ان روشن، مجرب اور الٰہی اصولوں کو اپنی معاشی پالیسیوں کا محور نہیں بنائے گی، اس وقت تک عالمی سطح پر غربت کا خاتمہ، طبقاتی کشمکش کا سدِباب اور ایک پرامن معاشرے کا قیام محض ایک دیوانے کا خواب ہی رہے گا۔ انسان کو بالآخر اس حقیقت کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا ہوگا کہ انسانیت کی معاشی فلاح کا راستہ وال اسٹریٹ (Wall Street) کے سٹہ بازاروں سے نہیں، بلکہ اس ربانی اور فقہی نظام سے ہو کر گزرتا ہے جو حقدار کو اس کا حق پوری عزت و تکریم کے ساتھ اس کی دہلیز پر پہنچانے کا ضامن ہے۔

نعتیہ ادب کی فکری جہات



از: مولانا غیاث الدین احمد عارف مصباحیؔ، مدرسہ عربیہ سعید العلوم، مہراج گنج

متفرقات

لُغت میں ''**نعت**'' کا مطلب ہے: تعریف کرنا، وصف بیان کرنا، صفت بیان کرنا یا کسی کی خوبیوں کو اجاگر کرنا۔ ادبی و اسلامی اصطلاح میں نعت سے مراد ''وہ صنفِ سخن (شاعری) ہے جس میں اللہ کے آخری نبی، حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذاتِ بابرکات کا ذکرِ جمیل، آپ کے شمائل و خصائل، اخلاقِ حسنہ اور معجزات وغیرہ کا بیان ہو، اور آپ ﷺ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کیا جائے۔''

چوں کہ نعت کا تعلق براہِ راست نبی کریم ﷺ کی مبارک ذات سے ہے، اس لیے فنی نکات کے ساتھ ساتھ سب سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ اس نازک فن میں غلو سے اجتناب کیا جائے۔ نعت لکھتے اور کہتے وقت قرآن و احادیث اور عقائد اسلامی کو پیش نظر رکھا جائے۔ صرف مستند واقعات یا اخلاقی تعلیمات کا ذکر کیا جائے، بے بنیاد قصے کہانیوں یا من گھڑت روایات کو نعتیہ شاعری میں لانے سے مکمل طور پر گریز کیا جائے۔ الفاظ کا انتخاب انتہائی نپا تُلا اور ادب کے دائرے میں رہے۔ نعت گوئی کا مقصد شہرت یا دنیاوی فائدہ نہ ہو، بلکہ محض رضائے الٰہی اور محبتِ رسول ﷺ کا حصول ہو۔ کیوں کہ اس صنف کی اصل جان ''اخلاص'' ہے۔ جیسا کہ کہا گیا ہے: ''از دل خیزد، بر دل ریزد'' (جو دل سے نکلتا ہے، وہ دلوں پر اثر کرتا ہے)۔ نعتیہ ادب میں فنی مہارت کی نمائش اگرچہ ادیبوں کی نظر میں ایک محبوب شی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دراصل درِ رسول اکرم ﷺ کی گدائی کا نام ہے۔ جب تک شاعر کے دل میں عشقِ حقیقی کی تڑپ نہ ہو، تب تک لفظوں کے موتی بے جان رہتے ہیں۔ جگر مرادآبادی نے کیا ہی عمدہ بات کہی کہ:

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں
پیغام محبت عام سہی، عرفانِ محبت عام نہیں

امام اہل سنت مجدد دین وملت حضرت علامہ شاہ امام احمد رضا خان بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اس کی نزاکت کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے کہ: ”حقیقتاً نعت شریف لکھنا بہت مشکل کام ہے جس کو لوگ آسان سمجھتے ہیں اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے۔ اگر شاعر بڑھتا ہے تو الوہیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہے۔ البتہ حمد آسان ہے کہ اس میں راستہ صاف ہے۔ جتنا چاہے بڑھ سکتا ہے۔ غرض حمد میں یک جانب کوئی حد نہیں اور نعت میں دونوں جانب سخت حد بندی ہے“۔

(الملفوظ، مطبوعہ کانپور، ص144/145)

حمدیہ اشعار کے بعد عقیدت و محبت اور فن و ادب کی بساط پر اگر کسی صنفِ سخن کو سب سے زیادہ تقدس، تکریم اور روحانی بلندی حاصل ہے، تو وہ ”نعت“ ہے۔ کیوں کہ نعت محض چند اشعار کی ترتیب کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ کائناتِ انسانی کی اپنے آقا و مولیٰ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ سے والہانہ وابستگی اور قلبی عقیدت کا ایک ایسا اظہار ہے جو زبان کی حدود سے ماورا ہو کر روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے۔

معلوم ہونا چاہیے کہ ”نعت گوئی“ کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنا کہ اسلام کا پیغام۔ اس کا آغاز خود دورِ نبوی ﷺ میں ہوا۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ جیسے صحابیِ رسول کے نعتیہ کلام کو خود دربارِ رسالت سے تائید حاصل ہوئی۔ ثنائے نبوی کی یہ مقدس کرن اگرچہ عرب میں چمکی مگر نعت کی یہ روایت صرف عربی ادب تک محدود نہیں رہی، بلکہ عجمی اور اردو ادب میں بھی ایک توانا لہر کی طرح بہتی چلی آئی ہے۔ سابقہ آسمانی صحیفوں سے لے کر آج تک، ہر دور میں اس ہستیِ مقدس کی مدح سرائی انسانیت کے لیے ذریعۂ نجات رہی ہے۔

اردو میں نعت گوئی کا سفر دکن کی سرزمین سے شروع ہوا۔ دکنی مثنویوں میں حمد کے ساتھ ساتھ نعتیہ اشعار کی شمولیت اس کی ابتدائی مثالیں ہیں۔ ولی دکنی کے دیوان کی شمالی ہند آمد کے بعد، اردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکی گئی اور غالب، ذوق، مومن سے لے کر دورِ جدید کے حالی، اقبال اور جگر مرادآبادی تک، ہر بڑے شاعر نے اپنے اپنے رنگ میں دربارِ نبوت میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ اسی طرح مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کا نعتیہ کلام آج بھی اپنے معیار اور وقار کی وجہ سے اردو زبان میں نعتیہ ادب کا ایک روشن باب ہے۔

درج بالا تمہید سے یہ واضح ہو گیا کہ نعتِ رسولِ مقبول ﷺ جہاں عقیدت و محبت کے اظہار کا وسیلہ ہے وہیں یہ ایک ایسا ادبی و فکری سمندر بھی ہے جس میں عقیدت کے ساتھ ساتھ انسانیت کی معراج، اخلاقی اقدار، معاشرتی اصلاح اور کائنات کی تخلیق کے فلسفے پوشیدہ ہیں۔ نعتیہ شاعری نے جہاں عقیدت کے پھول کھلائے ہیں، وہیں غزل اور نظم کی طرح اپنی ایک الگ اور توانا فکری شناخت بھی قائم کی ہے۔ ذیل میں نعتیہ ادب کی چند اہم فکری جہات کا اجمالی جائزہ پیش کیا جا رہا ہے:

توحید اور رسالت کا باہمی تعلق:

نعتیہ ادب میں ”توحید اور رسالت کا باہمی تعلق“ ایک بنیادی فکر ہے جس کے بغیر نعت کی عمارت قائم نہیں رہ سکتی۔ اسلامی عقیدے کے مطابق توحید اور رسالت دونوں پر ہی ایمان رکھنا لازمی ہے۔ چناں چہ جب شاعر حضور ﷺ کو ”مظہرِ صفاتِ الٰہی“ قرار دیتا ہے، تو وہ توحید کے فلسفے کو ایک نئی جہت دیتا ہے۔ یعنی نعت گو یہ فکر دیتا ہے کہ اگر اللہ کو دیکھنے کی تمنا ہے تو اس کے ”اسماء و صفات“ کے مظہر حضور اکرم ﷺ کی سیرت کو دیکھیں، کیوں کہ حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی اللہ تعالیٰ کی صفات کا عملی نمونہ ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ کی ذات ہی وہ واحد راستہ یا واسطہ ہے جو بندے کو خدا تک پہنچاتی ہے۔ جیسا کہ قرآنِ پاک کا واضح اعلان ہے کہ: مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ (جس نے رسول کا حکم مانا بیشک اس نے اللہ کا حکم مانا) نعتیہ ادب کا بنیادی فکری محور یہی عقیدہ ہے۔ نعت گو شاعر جب حضور ﷺ کی مدح سرائی کرتا ہے تو وہ دراصل اس ذات کی تعریف کر رہا ہوتا ہے جسے اللہ نے اپنا محبوب بنایا۔ یہاں توحید اور رسالت کا تعلق یوں قائم ہوتا ہے کہ رسالت، توحید تک پہنچنے کا واحد اور مستند ذریعہ ہے۔ اور خالق کی رضا، مخلوقِ اول یعنی نبی اکرم ﷺ کی پیروی میں مضمر ہے۔

اردو اور دیگر زبانوں کے معتبر نعت گو شعراء کے کلام میں توحید اور رسالت کا یہ سنگم خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ اپنے اشعار میں کلمۂ طیبہ کے دونوں حصوں کو ساتھ لے کر چلتے ہیں اور یہ واضح کرتے ہیں کہ نبوت کا چراغ توحید ہی کے فیض سے روشن ہے۔ ان کے کلام میں رسالت کا تذکرہ توحید کی نفی کے لیے نہیں بلکہ توحید کی تبلیغ کو مکمل کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ ان کی نظر میں توحید اور رسالت کا باہمی تعلق **”محبوب اور محب“** کے رشتے کی طرح ہے۔ جس طرح کوئی سچا محب اپنے محبوب کے خالق کو نظر انداز نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک سچا موحد حضور ﷺ کی شانِ رسالت کو تسلیم کیے بغیر توحید کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔ نعتیہ ادب اسی ”توحیدی وحدت“ اور ”رسالتی مرکزیت“ کا نام ہے، جو ایک مسلمان کو یہ سکھاتا ہے کہ خدا کی پہچان رسول ﷺ کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

اسوۂ حسنہ کا عملی پہلو:

نعت کا ایک اہم فکری پہلو حضور ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو ایک مثالی نمونے کے طور پر پیش کرنا ہے۔ جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد گرامی ہے: ﴿لَّقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الأحزاب: 21)

اس لیے نعتیہ شاعری میں جگہ جگہ یہ رجحان نمایاں ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کی سیرت سے اخلاقی سبق کشید کیے جائیں۔ آپ ﷺ کے اسوۂ مبارکہ سے سماجی انصاف، رواداری، عورتوں کے حقوق اور انسانی مساوات کا درس اور جدید دور کے پیچیدہ سماجی، اخلاقی و معاشی مسائل کے حل وغیرہ کی تعلیمات سیکھی جائیں۔ آپ ﷺ کے اخلاق حسنہ اور پاکیزہ کردار کو اپنے دل و جان اور

ذہن و فکر میں جاں گزیں کر لیا جائے۔ بعض مواقع پر میثاقِ مدینہ اور صلحِ حدیبیہ کے معاہدوں کا ذکر ہوتا ہے تاکہ ہم معاشرتی عدل کا طریقہ کار سیکھ سکیں۔ کہیں فاتحِ مکہ کے طور پر آپ ﷺ کے انکسار کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ اخلاق مصطفوی ﷺ اور قدیم و جدید آمریت اور تکبر کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔ کچھ اشعار میں خطبۂ حجۃ الوداع کے ابدی اصولوں کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے تاکہ معلوم ہو کہ کس طرح آپ ﷺ نے دنیا کو سود کے خاتمے، انسانی مساوات اور رنگ و نسل کے امتیاز کو الوداع کرنے کا درس دیا۔

ان کے علاوہ نبی اکرم ﷺ کی بردباری، طائف کے واقعات اور دشمنوں کی معافی، تجارت میں دیانت، پڑوسیوں سے حسن سلوک جیسے پہلوؤں کو مرکزی اہمیت دی جاتی ہے تاکہ عالمی سطح پر اسلام کے پر امن تشخص کو اجاگر کیا جا سکے۔ یعنی نعت کے توسل سے ایک ایسا فکری راستہ تیار کرنے کی بھرپور سعی کی جاتی ہے جو معاشرے کو ایک پر امن اور مثالی نظامِ زندگی کی طرف لے جانے میں مدد و معاون ثابت ہو۔

کائنات اور تخلیقِ کائنات کا فلسفہ:

کائنات کا وجود، اس کی وسعتیں اور اس کا نظمِ تخلیق انسانی عقل و خرد کے لیے ہمیشہ سے ایک معمہ رہا ہے۔ تاہم، اسلامی فکر، بالخصوص تصوف اور نعتِ رسول ﷺ کی لطیف زبان میں اس فلسفے کو ایک ایسے نقطۂ ارتکاز پر سمجھا گیا ہے جہاں کائنات کا ہر ذرہ اپنی تخلیق کا جواز اپنے خالق کے "محبوبِ مطلق" یعنی ذاتِ مصطفیٰ ﷺ میں تلاش کرتا ہے۔

اسلامی فکر و تصوف اور خوش عقیدگی کے حامل شعراء کائنات کی تخلیق کے فلسفے کو بھی نعت رسول ﷺ کے ذریعہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، ان کے اشعار میں جابجا اس حدیث مبارک "أتاني جبريل فقال: يا محمد لولاک ما خلقت الجنة، ولولاک ما خلقت النار" [كنز العمال، 11/194] کا عاشقانہ فلسفہ نظر آتا ہے، جہاں وہ بتاتے ہیں کہ کائنات کی تخلیق کا بنیادی سبب اور اس کا مرکزی محور ذاتِ مصطفیٰ ﷺ ہے۔

اہلِ ذوق شعراء نے اس عرفانی حقیقت کو جابجا نعت کے پیرائے میں ڈھالا ہے۔ جس سے وہ یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ کائنات کے وجود کا مقصد اللہ کی معرفت ہے، اور اللہ کی کامل معرفت کا راستہ صرف حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس سے ہو کر گزرتا ہے۔ لہٰذا کائنات کی رنگینیوں، ستاروں کی ضیا پاشیوں اور فطرت کے حسن کو حضور ﷺ کے "نورِ اوّل" کے پرتو کے طور پر دیکھا جائے۔ یوں، پوری کائنات ایک ایسی کتاب بن جاتی ہے جس کا ہر ورق ذاتِ مصطفیٰ ﷺ کی حمد و ثنا کا پیش خیمہ ہے۔ وہ ہمیں اس حقیقت سے روشناس کراتے ہیں کہ کائنات کے ساتھ انسان کا رشتہ دراصل بارگاہِ رسالت ﷺ سے وابستگی کا دوسرا نام ہے۔

جمالیات اور استعارہ سازی:

نبی اکرم ﷺ کے حسن و جمال کی تعریف و توصیف کرنا نعت گوئی کا ایک محبوب حصہ ہے۔ چناں چہ نعت گو شعرا حضور ﷺ کے سراپا اور شخصیت کے جمال کو بیان کرنے کے لیے کائنات کے خوبصورت ترین مظاہر کو استعارہ بنا کر استعمال کرتے ہیں۔ کائنات کی رنگینیوں، چاند کی چمک، سورج کی تابانی، پھولوں کی لطافت اور خوشبو کے سرور کو الفاظ کا لباس پہنا کر مدحتِ رسول ﷺ میں پیش کرتے ہیں، نیز حسنِ بیان، لفظیات کے انتخاب اور تخیل کی پرواز کے ذریعے حضور اکرم ﷺ کی ذاتِ گرامی کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

جو تشبیہات و تمثیلات کے ساتھ ساتھ عقیدت مند شاعر کے داخلی جذبات کی تصویر کشی کرتے ہیں۔ جب شاعر سرورِ دوجہاں ﷺ کے چہرہ مبارک کو چودھویں کے چاند سے تشبیہ دیتا ہے یا آپ ﷺ کی گفتگو کو پھولوں کی مہک سے تعبیر کرتا ہے، تو وہ زبان و بیان کی ان لطافتوں کو استعمال کر رہا ہوتا ہے جو قاری کے دل و دماغ پر ایک گہرا جمالیاتی اثر مرتب کرتی ہیں۔

شاعر جب کائنات کے مظاہر کو استعارہ بناتا ہے، تو اس کا مقصد حضور ﷺ کے ظاہری حسن کی تعریف کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ کے باطنی حسن اور اخلاقی و روحانی پاکیزگی کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے۔ یعنی چاند کی چمک حقیقت میں آپ ﷺ کے نورِ ہدایت کی علامت بن جاتی ہے، اور پھولوں کی مہک آپ ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور اخلاقِ کریمانہ کی خوشبو کا استعارہ ٹھہرتی ہے۔ اس طرح، شاعر فن کی ان باریکیوں کو بروئے کار لاتے ہوئے قاری کو ظاہری دنیا کے خوبصورت مظاہر سے نکال کر روحانیت کی اس دنیا میں لے جاتا ہے جہاں نورِ نبوی ﷺ کا مشاہدہ کیا جا سکے۔

انسانیت اور ہمدردی کا درس:

نعت کی ایک بہت اہم فکری جہت "**رحمتِ عالم**" کا پہلو ہے۔ آپ ﷺ کا پیغامِ محبت، جو نسل، رنگ اور زبان کی قید سے آزاد ہے، نعتیہ شاعری کا مرکزی نقطہ ہے۔ شاعر نعت کے ذریعے اس پیغام کو عام کرنا چاہتا ہے کہ اسلام امن اور انسانی ہمدردی کا دین ہے۔ کیوں کہ نعت جہاں مدحِ رسولِ باوقار ﷺ ہے، وہیں ایک ایسا فکری دبستان بھی ہے جو انسانی اخلاقیات کی تشکیل کرتا ہے۔ جب شاعر کہتا ہے کہ آپ ﷺ "رحمۃ للعالمین" ہیں، تو وہ دراصل اس آفاقی سچائی کو دہرا رہا ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا فیض صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ پوری کائنات اور ہر ذی روح کے لیے ہے۔ اور آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا ہر لمحہ انسانی ہمدردی کی ایک روشن مثال ہے۔ اسی لیے مداحِ رسول ﷺ اس فکر کو بہت خوبصورتی سے بیان کرتا ہے کہ آپ ﷺ نے یتیموں، بیواؤں، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کے ساتھ کیسا سلوک فرمایا۔ آپ ﷺ نے دکھی انسانیت کے آنسو کس طرح پونچھے۔ آپ ﷺ نے دشمنوں کو کس انداز سے معاف کیا اور انتقام کے بجائے درگزر کا راستہ اختیار کیا۔ اور

کس شانِ کریمانہ سے آپ ﷺ نے اپنے آخری خطبے میں یہ اعلان فرما کر کہ "کسی عربی کو عجمی پر اور کسی سفید فام کو سیاہ فام پر کوئی فضیلت حاصل نہیں" انسانی برابری کی بنیاد رکھی۔

اس کے علاوہ رحمتِ عالم ﷺ کی ہمدردی کا دائرہ صرف انسانوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ آپ ﷺ کی تعلیمات میں جانوروں، پرندوں، یہاں تک کہ درختوں اور پودوں کے حقوق کا بھی ذکر ملتا ہے۔ شاعر کے لیے نعت کا یہ پہلو اس لیے اہم ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعے تنگ نظری اور تعصبات کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے اور فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر جینے اور ہر مخلوق پر رحم کرنے کا درس دیتا ہے۔

عہدِ حاضر کے تناظر میں نعت:

یہ بات سچ ہے کہ نعت کی بنیاد حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ بابرکت سے والہانہ وابستگی اور مدحتِ رسول ﷺ پر قائم ہے، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس کی فکری جہات میں ایک خوشگوار اور معنی خیز تبدیلی آئی ہے۔ آج کا نعت گو صرف مدینے کی گلیوں اور روضۂ رسول ﷺ کے مناظر تک محدود نہیں رہا، بلکہ وہ اپنے عہد کے سلگتے ہوئے مسائل اور امتِ مسلمہ کی زبوں حالی کو بھی اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے۔

کیوں کہ حضورِ اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پوری کائنات کے لیے رحمت بن کر آئی ہے، لہٰذا آپ ﷺ کی تعلیمات کو آج کے دور کے مسائل کے تناظر میں پیش کرنا نعت کا اہم تقاضا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ موجودہ نعت گوئی میں فلسطین اور ہندوستان اور دیگر خطوں میں مسلمانوں پر ڈھائے جانے والے مظالم، عالمِ اسلام کے مجموعی زوال کے اسباب، اور اخلاقی گراوٹ جیسے موضوعات کو نعت کا حصہ بنایا جارہا ہے۔ شاعر ان دُکھوں اور مصائب وآلام کا ذکر کرتے ہوئے امت کو یہ پیغام دیتا ہے کہ ہماری نجات، ہماری ترقی اور ہماری بقا کا واحد راستہ حضورِ اکرم ﷺ کی سیرتِ طیبہ اور آپ ﷺ کی لائی ہوئی تعلیمات کی طرف واپسی ہے۔

مختصر یہ کہ نعت نے اپنی قدیم روایت کی پاسداری کرتے ہوئے عصری تقاضوں کے ساتھ خود کو نہایت کامیابی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ یہ صنفِ ادب اب محض اظہارِ عشق تک محدود نہیں رہی، بلکہ یہ ایک ایسا وسیع سمندر بن چکی ہے جس میں عقیدت کے پھولوں کے ساتھ ساتھ فکرِ فردا اور امتِ مسلمہ کے درد کا ذکر بھی شامل ہے۔ اپنی اس کثیر الجہتی حیثیت کی بدولت نعت نے خود کو ایک مستحکم اور باوقار ادبی صنف کے طور پر منوالیا ہے، جو آنے والے وقتوں میں بھی انسانیت کی رہنمائی اور امتِ مسلمہ کے اتحاد کا مرکز بنی رہے گی۔

اختلاف رائے اور وسعتِ نظر!

(حافظ) افتخار احمد قادری، کریم گنج، پورن پور، پیلی بھیت

متفرقات

اختلاف رائے انسانی فطرت کا ایک لازمی حصہ ہے۔ دنیا میں دو انسان ایسے نہیں ملتے جن کی عقل، فہم، مزاج، حالات، تجربات اور سوچ ہر اعتبار سے ایک جیسی ہو۔ اسی لیے اسلام نے اختلاف کے وجود کو تسلیم کیا مگر اس کے لیے ایسے اصول وضوابط مقرر کیے جن کے ذریعے اختلاف فساد، نفرت اور انتشار کے بجائے خیر، تحقیق اور اصلاح کا ذریعہ بن جائے۔ آج معاشرے میں اختلاف رائے کو دشمنی، مخالفت کو عداوت اور تنقید کو ذاتی حملہ سمجھ لیا گیا۔ جس نے امت کی علمی قوت کو کمزور اور فرقہ وارانہ تعصب کو فروغ دیا۔ قرآنِ کریم انسان کو بار بار عقل وفکر سے کام لینے کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

" جو لوگ بات کو غور سے سنتے ہیں پھر اس کی بہترین بات کی پیروی کرتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے ہدایت دی ہے اور یہی عقل والے ہیں" (زمر:18)

مسلمان کا مزاج یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر بات کو تحمل سے سنے، اس پر غور کرے اور دلیل کی بنیاد پر بہتر رائے کو اختیار کرے نہ کہ صرف اپنی پسند یا گروہی وابستگی کی بنیاد پر فیصلہ کرے۔ اسلام نے اندھی تقلید اور تعصب کی شدید مذمت کی ہے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد ہے": جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس چیز کی پیروی کرو جو اللہ نے نازل فرمائی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اسی راستے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا اگرچہ ان کے باپ دادا نہ کچھ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔"

(البقرہ:170)

حق کی پہچان شخصیت، خاندان یا جماعت سے نہیں بلکہ دلیل اور وحی سے ہوتی ہے۔ اگر کسی کا مؤقف دلیل کے خلاف ہو تو محض نسبت کی وجہ سے اس کی پیروی درست نہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اختلاف کے باوجود حسنِ اخلاق اور نرم روی کا درس دیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: "مضبوط شخص وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو گرا دے بلکہ مضبوط وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو رکھے۔" (صحیح بخاری:6114)

اختلاف کے وقت اصل امتحان انسان کے اخلاق کا ہوتا ہے۔ جو شخص دلیل ختم ہونے پر گالی، طعنہ اور تحقیر کا سہارا لیتا ہے وہ علمی میدان میں اپنی کمزوری کا اظہار کرتا ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان بھی متعدد فقہی اور اجتہادی اختلافات ہوئے لیکن ان اختلافات نے کبھی ان کے باہمی احترام کو ختم نہیں کیا۔ ہر صحابی دوسرے کی نیت، دیانت اور اخلاص پر اعتماد رکھتا تھا۔ یہی اسلامی اختلاف کا اصل نمونہ ہے کہ رائے مختلف ہو سکتی ہے مگر دل ایک دوسرے کے لیے صاف رہتے ہیں۔

قرآن کریم نے عدل کا حکم دیتے ہوئے فرمایا: کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو، انصاف کرو یہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے" (المائدہ:8)

یہ اصول صرف دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے مخالفین کے ساتھ بھی نافذ ہوتا ہے۔ اگر کسی شخص یا جماعت سے اختلاف ہو تو بھی اس کی اچھی بات کو تسلیم کرنا اور اس پر ظلم یا بہتان نہ باندھنا اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے۔ آج اختلاف رائے کو ایمان و کفر، حق و باطل اور محبت و عداوت کا معیار بنا دیا گیا۔ جو شخص کسی مسئلے میں مختلف رائے رکھتا ہے اسے فوراً گمراہ، بدعتی یا دشمن قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ رویہ نہ قرآن کریم کے مطابق ہے نہ سنت کے مطابق اور نہ ہی سلفِ صالحین کے طریقے کے مطابق۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔"

(صحیح بخاری، کتاب الایمان:10)

جب زبان سے مسلمان محفوظ رہنے چاہئیں تو پھر اختلاف کی بنیاد پر کسی کی عزت اچھالنا، کردار کشی کرنا، تہمت لگانا یا نفرت پھیلانا کس طرح اسلامی عمل ہو سکتا ہے؟ اختلاف اگر تہذیب، علم اور انصاف کے دائرے میں رہے تو رحمت بنتا ہے لیکن جب اس میں انا، تعصب اور نفرت شامل ہو جائے تو وہ امت کے زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ اسلام وسعتِ نظر کی تعلیم دیتا ہے۔ وسعتِ نظر کا مطلب یہ نہیں کہ حق و باطل کو ایک سمجھ لیا جائے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر مسئلے کو انصاف، دلیل اور تحقیق کی روشنی میں دیکھا جائے مخالف کی بات سنی جائے۔ اگر وہ درست ہو تو اسے قبول کرنے میں عار محسوس نہ کی جائے اور اگر غلط ہو تو اس کی اصلاح حکمت، نرمی اور اخلاق کے ساتھ کی جائے۔ یہی انبیائے کرام کا طریقہ ہے اور یہی امت کے اکابر علماء کا منہج رہا ہے۔ اختلافِ رائے کی سب سے روشن مثال ہمیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں ملتی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ افراد تھے۔ ان کے درمیان متعدد فقہی اور اجتہادی مسائل میں اختلافات ہوئے لیکن کسی نے دوسرے کی نیت پر حملہ نہیں کیا نہ کسی کو اسلام سے خارج قرار دیا اور نہ ذاتی دشمنی کو فروغ دیا۔ یہی وہ اسلامی مزاج ہے جسے آج زندہ کرنے کی

ضرورت ہے۔ آج معمولی فقہی اختلافات کو بھی ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے دین کی بنیادیں خطرے میں پڑ گئی ہوں حالانکہ امت کے اکابر آئمہ نے ہمیشہ اختلاف کو علمی دائرے میں رکھا۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

" اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو خوب تحقیق کر لیا کرو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو پھر اپنے کیے پر پشیمان ہونا پڑے۔"(حجرات:6)

آج سوشل میڈیا اور مختلف ذرائع کے ذریعے بغیر تحقیق کے خبریں، الزامات اور فتوے عام کیے جاتے ہیں۔ لوگ کسی عالم، دینی جماعت یا شخصیت کے خلاف ایک غیر مصدقہ بات سن کر فوراً اس کی تشہیر شروع کر دیتے ہیں حالانکہ قرآن کریم کا واضح حکم تحقیق کرنا ہے نہ کہ اندھی تقلید میں ہر بات کو قبول کر لینا۔ اسی سورہ حجرات میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

" اور آپس میں ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑاؤ نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارو"۔(حجرات:11)

یہ حکم صرف عام مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ علماء، خطباء، داعیان دین اور دینی کارکنوں کے لیے بھی یکساں ہے۔ آج اختلافِ رائے کے نام پر طنز، تمسخر، تحقیر اور کردار کشی کو علمی خدمت سمجھ لیا گیا ہے جبکہ قرآن کریم اسے ایمان کے شایانِ شان قرار نہیں دیتا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:" آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کر دے۔" (صحیح مسلم)

اختلاف کے ماحول میں اکثر لوگ بغیر تحقیق کے دوسروں پر الزامات عائد کرتے ہیں، ویڈیوز یا تحریروں کے چند جملے کاٹ کر پھیلا دیتے ہیں اور لوگوں کی بدگمانیوں کو ہوا دیتے ہیں۔ یہ طرزِ عمل نہ صرف اخلاقی جرم ہے بلکہ شریعت کی نظر میں بھی سخت قابلِ مذمت ہے۔ اسلام نے اختلاف کے وقت حسنِ گفتگو کو بھی لازم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا :

" لوگوں سے اچھی بات کہو"۔(البقرہ؛83)

اس حکم میں کسی خاص طبقے کی تخصیص نہیں کی گئی۔ دوست ہو یا مخالف، عالم ہو یا عام آدمی ہر ایک سے شائستگی اور احترام کے ساتھ گفتگو کرنا اسلامی اخلاق کا حصہ ہے۔ اگر دلیل مضبوط ہو تو سخت لہجے کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور اگر دلیل کمزور ہو تو سخت زبان بھی انسان کو کامیاب نہیں بنا سکتی۔ تاریخِ اسلام اس حقیقت کی گواہ ہے کہ چاروں ائمہ مجتہدین کے درمیان متعدد مسائل میں اختلاف رہا لیکن ایک دوسرے کے علم، تقویٰ اور مقام کا اعتراف بھی موجود رہا۔ ان حضرات نے کبھی اپنے اختلاف کو امت کی تقسیم کا ذریعہ نہیں بنایا۔ انہوں نے اپنے شاگردوں کو بھی یہی تعلیم دی کہ اگر کسی دوسرے امام کی رائے دلیل کے اعتبار سے زیادہ مضبوط معلوم ہو تو اسے اختیار کرنے میں کوئی عار نہیں۔ یہی وسعتِ نظر ہے جو امت کو علمی ترقی عطا کرتی ہے۔ وسعتِ نظر کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ باطل عقائد یا صریح گمراہی کو حق مان لیا جائے۔ اسلام حق و باطل کے درمیان

واضح فرق قائم رکھتا ہے۔ لیکن جن مسائل میں علماء کے درمیان اجتہادی اختلاف کی گنجائش ہو وہاں ایک دوسرے کی نیت، اخلاص اور دیانت پر حملہ کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔ اختلاف دلیل سے کیا جائے کردار کشی سے نہیں۔ علم سے کیا جائے جذبات سے نہیں۔ اصلاح کی نیت سے کیا جائے انتقام کی نیت سے نہیں۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا :

" مومن طعنہ دینے والا، لعنت کرنے والا، فحش گو اور بدزبان نہیں ہوتا"۔ (جامع ترمذی، کتاب البر والصلۃ:1977)

دین کی دعوت کا اصل حسن علم، حلم اور حسنِ اخلاق میں ہے نہ کہ شور، اشتعال اور بدزبانی میں۔ جب اختلاف انصاف، تحقیق، تحمل اور اخلاص کے ساتھ کیا جاتا ہے تو وہ امت کے لیے رحمت بن جاتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعے علمی مسائل واضح ہوتے ہیں اور حق تک پہنچنے کی راہیں کھلتی ہیں لیکن جب اختلاف تعصب، انا، شہرت طلبی اور جماعتی عصبیت کا شکار ہو جائے تو پھر وہ امت کی وحدت، علمی وقار اور دینی ساکھ کو شدید نقصان پہنچاتا ہے۔ یہی وہ بیماری ہے جس کا علاج قرآن وسنت کی تعلیمات اور اسلافِ امت کے معتدل طرزِ عمل میں پوشیدہ ہے۔ اسلام نے جہاں حق پر ثابت قدم رہنے کا حکم دیا وہیں اس حق کو پیش کرنے کا طریقہ بھی سکھایا ہے۔ قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے :"اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے ایسے انداز میں گفتگو کرو جو سب سے بہتر ہو۔"(النحل:125)

دعوت، اصلاح اور اختلاف، تینوں کا اصل سرمایہ حکمت، برداشت اور حسنِ گفتگو ہے۔ اگر کوئی شخص حق بات بھی سخت مزاجی، تحقیر، بدزبانی اور نفرت کے ساتھ پیش کرے تو وہ قرآن کے بیان کردہ اسلوب سے ہٹ جاتا ہے۔ اسی لیے علماءِ حق نے ہمیشہ دلیل کو جذبات پر اور اخلاق کو اشتعال پر ترجیح دی۔ قرآنِ مجید ایک اور مقام پر فرماتا ہے:"بھلائی اور برائی برابر نہیں ہو سکتیں، برائی کو اس طریقے سے دور کرو جو سب سے بہتر ہو، پھر وہ شخص جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی، وہ بھی ایسا ہو جائے گا جیسے گہرا دوست ہو۔"(فصلت:34)

نفرت کا جواب نفرت سے اور گالی کا جواب گالی سے دینا اسلامی مزاج نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق، صبر اور حسنِ سلوک کے ذریعے دلوں کو جیتنا انبیائے کرام کا طریقہ ہے۔ اگر ہر اختلاف کا جواب اشتعال سے دیا جائے تو امت میں کبھی اتحاد پیدا نہیں ہو سکتا۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا :"جو شخص اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ بھلی بات کہے یا خاموش رہے۔"
(صحیح بخاری، کتاب الادب، حدیث 6018؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، حدیث 47)

یہ حدیث اختلافِ رائے کے باب میں ایک عظیم اصول ہے۔ ہر انسان کو اپنی زبان کا محاسبہ کرنا چاہیے کہ کہیں اس کی گفتگو کسی مسلمان کی عزت، آبرو یا دل کو مجروح تو نہیں کر رہی۔ قلم اور زبان اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتیں ہیں، اگر ان کا استعمال اصلاح کے بجائے فساد کے لیے ہونے لگے تو یہی نعمتیں قیامت کے دن وبال بن سکتی ہیں۔ آج امتِ مسلمہ کو جن بڑے مسائل کا سامنا ہے ان میں ایک اہم مسئلہ برداشت کا فقدان ہے۔ معمولی فقہی، تنظیمی یا فکری اختلافات کو بنیاد بنا کر ایک دوسرے کی نیتوں پر

حملے کیے جاتے ہیں، تکفیر، تفسیق اور تذلیل کا بازار گرم کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ طرزِ عمل امت کو کمزور کرنے کے سوا کوئی فائدہ نہیں دیتا۔ اختلاف اگر علم کے دائرے میں رہے تو امت کی علمی ترقی کا ذریعہ بنتا ہے لیکن جب وہ انا، تعصب اور ذاتی مفاد کا شکار ہو جائے تو تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔" (آلِ عمران: 103)

اتحاد کا مطلب یہ نہیں کہ تمام فقہی یا اجتہادی آراء ختم ہو جائیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اختلاف کے باوجود دلوں میں نفرت پیدا نہ ہو، ایک دوسرے کی عزت باقی رہے اور سب کا مقصد اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اللہ نرمی کرنے والا ہے اور نرمی کو پسند کرتا ہے اور نرمی پر وہ کچھ عطا فرماتا ہے جو سختی پر عطا نہیں فرماتا۔"

(صحیح مسلم: حدیث 2593)

نرم مزاجی کمزوری نہیں بلکہ نبوی اخلاق ہے۔ جو شخص لوگوں کی اصلاح چاہتا ہے اسے سخت زبان سے زیادہ نرم دل اور مضبوط دلیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ دل تلوار سے نہیں بلکہ اخلاق سے فتح ہوئے ہیں۔ وسعتِ نظر کا تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اپنی رائے کو حرفِ آخر نہ سمجھے۔ ممکن ہے کسی دوسرے کے پاس ایسی دلیل ہو جو زیادہ قوی ہو یا کوئی ایسا پہلو ہو جو ہماری نگاہ سے اوجھل رہ گیا ہو۔ یہی علمی دیانت ہے اور یہی اہلِ علم کا شیوہ رہا ہے۔ تکبر علم کو ختم کر دیتا ہے جبکہ تواضع علم میں برکت پیدا کرتی ہے۔ یہ حقیقت بھی ہمیشہ پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ امت کی قوت اختلافات بڑھانے میں نہیں بلکہ مشترکات کو مضبوط کرنے میں ہے۔ عقائدِ قطعیہ، قرآنِ کریم، سنتِ نبوی ﷺ، محبتِ رسول ﷺ، احترامِ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم، اہلِ بیتِ اطہار رضی اللہ عنہم اور دینِ اسلام کی بنیادی تعلیمات وہ عظیم سرمایہ ہیں جن پر پوری امت متفق ہے۔ اگر انہی بنیادوں کو مضبوط کیا جائے اور اختلافی مسائل میں عدل، تحقیق اور حسنِ اخلاق کو اختیار کیا جائے تو امت کا بڑا حصہ بہت سے فتنوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ آخر میں ہر مسلمان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ہم سے یہ سوال نہیں کرے گا کہ تم نے کتنے لوگوں کو اپنی رائے پر مجبور کیا بلکہ یہ پوچھے گا کہ تم نے حق کو کس اخلاص کے ساتھ سمجھا، کس دیانت کے ساتھ بیان کیا اور اختلاف کے وقت تمہارا اخلاق، انصاف اور کردار کیسا تھا؟ لہٰذا! اختلافِ رائے کو دشمنی کا ذریعہ بنانے کے بجائے اصلاح، خیر خواہی، تحقیق اور تقویٰ کا ذریعہ بنایا جائے یہی قرآن کریم کی تعلیم، سنتِ نبوی ﷺ کا پیغام اور اسلافِ امت کا روشن منہج ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو امت میں علمی وقار، باہمی احترام اور حقیقی اتحاد کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے۔



سوشل میڈیا اور اخلاقی زوال

از: انیس الرحمن حنفی رضوی، جامعہ رضویہ زینت العلوم ضلع مرادآباد

متفرقات

مکرمی انسانی تاریخ کے ہر دور میں ذرائعِ ابلاغ نے معاشروں کی فکری، تہذیبی اور اخلاقی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ جس معاشرے کے ذرائعِ ابلاغ صالح، متوازن اور ذمہ دار رہے۔ وہاں خیر، علم، شعور اور اخلاقی اقدار کو فروغ ملا، اور جہاں ابلاغی ذرائع بے لگام، غیر ذمہ دار اور مفاد پرستانہ رجحانات کے حامل ہوئے وہاں فکری انتشار، اخلاقی انحطاط اور تہذیبی بگاڑ نے جنم لیا۔ موجودہ دور کو انفارمیشن ٹیکنالوجی کا دور کہا جاتا ہے۔ دنیا ایک عالمی گاؤں کی صورت اختیار کر چکی ہے، فاصلے سمٹ گئے ہیں، معلومات تک رسائی آسان ہو گئی ہے، اور انسان چند لمحوں میں دنیا کے کسی بھی گوشے سے رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اس انقلابی تبدیلی کا سب سے نمایاں مظہر سوشل میڈیا ہے جس نے ابلاغ و ترسیل کے روایتی تصورات کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے۔

سوشل میڈیا بلاشبہ عصر حاضر کی ایک عظیم ایجاد ہے جس کے ذریعے علم و تحقیق، دعوت و تبلیغ، تعلیم و تربیت، سماجی رابطہ اور عوامی آگاہی کے بے شمار مواقع پیدا ہوئے ہیں، لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ یہی سوشل میڈیا آج اخلاقی زوال، تہذیبی بے راہ روی، فکری انتشار اور سماجی بے اعتدالی کا ایک بڑا ذریعہ بنتا جا رہا ہے۔ جدید دنیا میں اخلاقی اقدار کو جن خطرات کا سامنا ہے ان میں سوشل میڈیا کا بے جا اور غیر محتاط استعمال سر فہرست دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا میدان بن چکا ہے جہاں خیر و شر، حق و باطل، علم و جہالت اور تعمیر و تخریب سب ایک ساتھ موجود ہیں۔ اب یہ انسان کے اختیار پر منحصر ہے کہ وہ اس سے خیر حاصل کرتا ہے یا شر۔

اسلام نے انسانی زندگی کی بنیاد اخلاقِ حسنہ پر رکھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا ایک اہم مقصد ہی اخلاقی اقدار کی تکمیل قرار دیا گیا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إنما بعثت لأتمم مكارم الأخلاق یعنی میں بہترین اخلاق کی تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ (مسند احمد)

قرآن کریم نے بھی متعدد مقامات پر اخلاقی تطہیر اور کردار سازی کو کامیابی کا معیار قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (البقرۃ:83) یعنی "لوگوں سے بھلی بات کہو۔" ایک اور مقام پر فرمایا: مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ إِلَّا لَدَيْهِ رَقِيبٌ عَتِيدٌ (ق:18) یعنی "انسان جو بات بھی زبان سے نکالتا ہے اس پر ایک نگہبان مقرر ہوتا ہے۔

اگر ان قرآنی تعلیمات کو سوشل میڈیا کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آج کا سب سے بڑا بحران زبان اور قلم کا بحران ہے۔ سوشل میڈیا پر لاکھوں افراد بغیر تحقیق، بغیر ذمہ داری اور بغیر اخلاقی حدود کے اظہارِ رائے کرتے ہیں۔ گالم گلوچ، کردار کشی، بہتان تراشی، جھوٹ، تحقیر، تضحیک اور الزام تراشی معمول بنتی جارہی ہے۔ اختلافِ رائے جو علمی معاشروں کی زینت ہوتا ہے، دشمنی اور نفرت میں تبدیل ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے واضح حکم دیا: يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ وَلَا تَجَسَّسُوا وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (الحجرات:12)

یعنی "بہت سے گمانوں سے بچو، بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، تجسس نہ کرو اور ایک دوسرے کی غیبت نہ کرو۔" افسوس کہ یہی تمام امور آج سوشل میڈیا کی بڑی شناخت بنتے جارہے ہیں۔

اخلاقی زوال کا ایک اہم پہلو حیا اور عفت کے تصورات کا کمزور ہونا بھی ہے۔ اسلام نے حیا کو ایمان کا جزو قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: الحياء شعبة من الإيمان (صحیح بخاری) یعنی حیا ایمان کی ایک شاخ ہے۔

مگر سوشل میڈیا کے مختلف پلیٹ فارمز پر فحاشی، عریانی، بے حیائی اور شہوانی مواد کی فراوانی نے نوجوان نسل کے ذہن و فکر کو شدید متاثر کیا ہے۔ ایسے مناظر جو کبھی معاشرتی معیوب سمجھے جاتے تھے آج فیشن اور آزادی کے نام پر عام کیے جارہے ہیں۔

نتیجتاً خاندانوں کی بنیادیں کمزور، تعلقات غیر مستحکم اور اخلاقی حدود پامال ہو رہی ہیں۔ قرآن مجید نے تنبیہ فرمائی:

إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَنْ تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النور:19)

یعنی جو لوگ چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان میں بے حیائی پھیلے ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

سوشل میڈیا نے انسانی شخصیت میں خود نمائی اور شہرت پسندی کے رجحان کو بھی غیر معمولی حد تک بڑھا دیا ہے۔ لائکس، فالوورز، ویوز اور مقبولیت کی دوڑ نے اخلاص، سادگی اور حقیقت پسندی کو نقصان پہنچایا ہے۔ بہت سے افراد اپنی حقیقی زندگی کے بجائے مصنوعی اور نمائشی زندگی پیش کرنے لگے ہیں۔ اس عمل نے حسد، احساسِ کمتری، نفسیاتی دباؤ اور معاشرتی بے چینی کو جنم دیا ہے۔ اسلام نے ریاکاری اور نمود و نمائش سے بچنے کی تعلیم دی ہے کیونکہ اعمال کی قبولیت کا دار و مدار اخلاص پر ہے۔ جب انسان اپنی شخصیت کو دوسروں کی توجہ کا مرکز بنانے میں مصروف ہو جاتا ہے تو اخلاقی توازن متاثر ہونے لگتا ہے۔

سوشل میڈیا کے ذریعے جھوٹی خبروں اور افواہوں کی تیز رفتار ترسیل بھی ایک سنگین اخلاقی مسئلہ بن چکی ہے۔ کسی خبر کی تحقیق کیے بغیر اسے آگے بڑھا دینا آج معمول بن گیا ہے۔ قرآن کریم نے اس رویے کی سخت مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (الحجرات:6) یعنی "اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لیا کرو۔" اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: كفى بالمرء كذبًا أن يحدث بكل ما سمع (صحیح مسلم) یعنی "آدمی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ ہر سنی سنائی بات بیان کرتا پھرے۔"

موجودہ دور میں یہ حدیث سوشل میڈیا کے استعمال کنندگان کے لیے ایک عظیم اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔

اخلاقی زوال کا ایک پہلو وقت کا ضیاع بھی ہے۔ سوشل میڈیا کے بے جا استعمال نے انسان کو سنجیدہ مطالعے، خاندانی تعلقات، علمی سرگرمیوں اور تعمیری مصروفیات سے دور کر دیا ہے۔ گھنٹوں اسکرین کے سامنے گزار دینے کے باوجود انسان کے علم، کردار اور عملی زندگی میں کوئی مثبت اضافہ نہیں ہوتا۔ اسلام وقت کو ایک عظیم نعمت قرار دیتا ہے۔ سورۂ عصر میں اللہ تعالیٰ نے زمانے کی قسم کھا کر انسان کو خسارے سے بچنے کی راہ دکھائی ہے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو فضول اور بے مقصد مصروفیات انسان کے دینی و دنیاوی نقصان کا سبب بنتی ہیں۔

خاندانی نظام بھی سوشل میڈیا کے منفی اثرات سے محفوظ نہیں رہا۔ گھروں میں موجود افراد جسمانی طور پر تو ایک ساتھ ہوتے ہیں لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ والدین اور اولاد کے درمیان مکالمہ کم ہو رہا ہے، رشتوں میں بے اعتمادی بڑھ رہی ہے اور حقیقی تعلقات کی جگہ ورچوئل تعلقات لے رہے ہیں۔ یہ صورت حال معاشرتی استحکام کے لیے خطرناک ہے کیونکہ مضبوط خاندان ہی مضبوط معاشرے کی بنیاد ہوتے ہیں۔

اس تمام صورت حال کے باوجود سوشل میڈیا کو مطلقاً شر یا فساد قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک طاقتور ذریعہ ہے جس کا استعمال خیر اور شر دونوں کے لیے ممکن ہے۔ جس طرح قلم سے علم بھی لکھا جا سکتا ہے اور گمراہی بھی پھیلائی جا سکتی ہے، اسی طرح سوشل میڈیا بھی انسان کے اخلاقی شعور کے مطابق نتائج پیدا کرتا ہے۔ آج بے شمار دینی ادارے، علماء، محققین اور دعوتی تنظیمیں اسی ذریعے سے قرآن و سنت کی تعلیمات عام کر رہی ہیں، علمی مواد نشر کر رہی ہیں اور نوجوان نسل کی فکری رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہی ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سوشل میڈیا کے استعمال کو اسلامی اخلاقیات کے تابع بنایا جائے۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ سوشل میڈیا پر اپنی ہر تحریر، تصویر، ویڈیو اور تبصرے کو شریعت کی کسوٹی پر پرکھیں۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، تحقیر، فحاشی، نفرت انگیزی اور غیر ضروری مباحث سے اجتناب کریں۔ خبر نشر کرنے سے پہلے تحقیق کریں، اختلاف میں شائستگی اختیار کریں، وقت کے استعمال میں اعتدال پیدا کریں اور سوشل میڈیا کو علم، دعوت، اصلاح اور خیر کے فروغ کا ذریعہ بنائیں۔ اگر قرآن و سنت کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے اس جدید ذریعے کو استعمال کیا جائے تو یہ معاشرے کی اصلاح اور اخلاقی تعمیر کا مؤثر وسیلہ بن سکتا ہے، لیکن اگر اسے خواہشاتِ نفس، شہرت طلبی اور بے لگام آزادی کے تابع کر دیا جائے تو یہی ذریعہ اخلاقی زوال، فکری انتشار اور تہذیبی انحطاط کا سبب بنے گا۔

آج امتِ مسلمہ بالخصوص نوجوان نسل کے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ وہ سوشل میڈیا کی چمک دمک اور ظاہری کشش کے پیچھے اپنی اخلاقی شناخت، دینی اقدار اور تہذیبی ورثے کو فراموش نہ کرے۔ اخلاق ہی انسان کا حقیقی سرمایہ اور معاشروں کی اصل قوت ہیں۔ جب اخلاق باقی رہتے ہیں تو قومیں زندہ رہتی ہیں اور جب اخلاق ختم ہو جاتے ہیں تو ترقی، ٹیکنالوجی اور مادی آسائشیں بھی انہیں زوال سے نہیں بچا سکتیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ سوشل میڈیا کے استعمال میں اسلامی تعلیمات، اخلاقی حدود اور انسانی ذمہ داریوں کو پیشِ نظر رکھا جائے تاکہ جدید ذرائعِ ابلاغ انسانیت کی تعمیر کا ذریعہ بنیں نہ کہ اخلاقی تباہی کا۔



امام احمد رضا کے قصیدۂ معراج میں جلوۂ عرفان

قسط سوم

از: مولانا ازہر القادری، جامعہ مٹھنا، سدھارتھ نگر

متفرقات

وہاں فلک پر یہاں زمیں میں رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں
ادھر سے انوار ہنستے آتے ادھر سے نفحات اٹھ رہے تھے

لفظوں نے اپنے ہونٹوں پر تبسم کی پوتی مل کر کاغذ کے آستانے پر دستک دی کہ آج بیان کی دنیا میں وہ در کھلنے والا ہے جس کے پیچھے نور کی بارش ہے اور خوشبوؤں کے قافلے ہیں، جہاں معنی اپنے بازو کھولے اڑتے ہیں اور مفہوم اپنے دامن میں اسرار سمیٹے جھومتے ہیں، آج ہم اس شعر کے در و دیوار کو دیکھیں گے جس میں فلک اور زمیں ایک ہی شادی خانے میں بدل جاتے ہیں، جہاں عرش کی رفعتیں زمین کے فرش سے مصافحہ کرتی ہیں اور جہاں آسمانی انوار مسکرا کر استقبال کرتے ہیں اور زمینی فضائیں نفحات کی سانسوں سے مہک جاتی ہیں، یہ وہ لمحہ ہے جس میں وقت بھی رک کر دیکھتا ہے اور مکان بھی ٹھٹھک کر سنتا ہے کہ امام عشق و محبت نے لفظوں کے آسمان پر کیسی قوس قزح کھینچ دی ہے۔

یہ شعر اپنے پہلے ہی مصرع میں کائنات کو دو حصوں میں بانٹ کر پھر دونوں کو ایک مرکز پر لا کھڑا کرتا ہے، وہاں فلک پر بھی رچی ہے، یہاں زمیں میں بھی، وہاں بھی شادی ہے، یہاں بھی، وہاں بھی دھوم ہے، یہاں بھی، گویا یہ معراج کی ساعت ایسی ہمہ گیر ساعت ہے جس میں آسمان کی پیشانی پر بھی مسرت کا چمکتا ہوا ٹیکا ہے اور زمین کے ماتھے پر بھی، ایک ہی خوشی دو جہانوں کے در و بام پر دستک دے رہی ہے، ایک ہی مسکراہٹ دو جہانوں کے لبوں پر پھیل رہی ہے، صنعت تضاد کی نرم سی جھلک کے ساتھ صنعت مراعات النظیر کا حسن بھی جلوہ گر ہے کہ فلک کے لیے رچی اور زمین کے لیے دھومیں، دونوں اپنی اپنی سطح پر خوشی کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں اور پھر صنعت حسن تعلیل کا دروازہ کھلتا ہے کہ یہ سب اس لیے ہے کہ محبوب خدا کی تشریف آوری ہے، یہ سب اس لیے ہے کہ شب معراج اپنی جلوہ گری کے ساتھ آئی ہے۔

لفظ "رچی" اس مصرع میں محض ایک فعل نہیں بلکہ ایک مکمل کیفیاتی اور جمالیاتی پیکر ہے جو اپنے اندر سرور، وقار، رچاؤ اور دوام کے کئی جہان سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کے لغوی دائرے میں کسی شے کا پوری طرح قائم ہو جانا، اس طرح پھیل جانا کہ ہر سمت اسی کا رنگ چڑھ جائے اور اس کے اثر کی مہک ہر فضا میں بس جائے، شامل ہے؛ مگر امام عشق و محبت نے اسے محض "ہوئی" کے سادہ مفہوم پر نہیں چھوڑا بلکہ اسے ایک زندہ اور دھڑکتی ہوئی کیفیت بنا دیا ہے۔ یہاں شادی کوئی عارضی واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی نورانی فضا ہے جو فلک کی رفعتوں اور زمیں کی پہنائیوں میں رچ بس گئی ہے، جیسے خوشبو پھول کے ریشوں میں اتر جائے اور رنگ صبح کی کرنوں میں گھل جائے۔ یہ وہ سرور ہے جو آنکھ سے دکھائی دیتا ہے، دل سے محسوس ہوتا ہے اور روح میں جاگزیں ہو جاتا ہے، جس میں کائنات کے ذرے ذرے نے خوشی کا لباس پہن لیا اور زمانے کی نبض نے مسرت کی لے پکڑ لی۔

اس ایک لفظ میں رچاؤ بھی ہے اور ٹھہراؤ بھی، جمال بھی ہے اور وقار بھی، یعنی یہ جشن محض شور و ہنگامہ نہیں بلکہ ایک باوقار، متین اور نورانی تجلی ہے جو لمحے کی طرح آکر گزر نہیں جاتی بلکہ کیفیت بن کر قائم رہتی ہے۔ یہ وہ شادی ہے جو تماشہ نہیں بلکہ عبادت کی سی ہیبت رکھتی ہے، جو ہنگامہ نہیں بلکہ ہم آہنگی کی نغمگی ہے، جو شور نہیں بلکہ سرور کی خاموش مسکراہٹ ہے۔ عرفانی سطح پر یہ معراج کی اس ساعت کا استعارہ ہے جس میں آسمان جھک گیا اور زمین سرخرو ہوئی، جہاں عبد و معبود کے قرب پر کائنات نے اپنی پلکوں سے چراغ جلائے، فضاؤں نے خوشی کو سانس بنایا اور زمانے نے اس لمحے کو اپنے ماتھے کا جھومر بنا لیا۔ یوں "رچی" میں امام احمد رضا خان نے ایک ایسا دائمی جشن رکھ دیا ہے جو فلک کی وسعتوں میں بھی مہکتا ہے اور زمیں کی پہنائیوں میں بھی جگمگاتا ہے۔ اور زمیں میں دھومیں مچی ہیں، یعنی زمین ایک باراتی کی طرح نغمے گاتی اور نعرے لگاتی، خوشی کے قہقہے اچھالتی نظر آتی ہے، یہ منظر نگاری اپنے اندر اتنی حرکت رکھتی ہے کہ قاری خود کو اس جشن کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

یہاں فلک اور زمین کے بیچ جو فاصلہ صدیوں سے قائم تھا وہ ایک لمحے میں سمٹ جاتا ہے، معراج کی ساعت وہ پل ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتا ہے، یہ وہ لمحہ ہے جس میں کائنات کی دو انتہائیں ایک مرکز پر آکر سلام کہتی ہیں، یہ وحدت تاثر کا وہ درخشاں نمونہ ہے جس میں موضوع بھی ایک ہے، خیال بھی ایک، جذبہ بھی ایک اور اظہار بھی ایک، امام نے اپنے حسن انتخاب سے وہ لفظ چنے ہیں جو نہ صرف معنی کے آئینے میں جگمگاتے ہیں بلکہ صوتی حسن کے گہوارے میں بھی جھولتے ہیں، رچی اور دھومیں کے حروف میں جو نغمگی ہے وہ بحر کے آہنگ سے مل کر ایک موسیقیت پیدا کرتی ہے جو دل کے کانوں میں رس گھول دیتی ہے۔

دوسرے مصرع میں منظر کا زاویہ بدلتا ہے اور خوشی کی ایک اور صورت سامنے آتی ہے، ادھر سے انوار ہنستے آتے ہیں، یعنی نور کی کرنیں مسکرا کر استقبال کو بڑھتی ہیں، یہاں نور کو ہنستا ہوا دکھا کر شاعر نے تجسیم اور تشخیص دونوں کو ایک ساتھ برتا ہے، نور ایک بے جان شے نہیں رہا بلکہ ایک مسکراتا ہوا مہمان بن گیا ہے جو ہاتھ میں روشنی کے پھول لیے استقبال کو بڑھتا ہے، اور

ادھر سے نفحات اٹھ رہے ہیں، یعنی خوشبو کے جھونکے، مہک کے قاصد، نسیم کے پیامبر چاروں طرف سے دوڑے چلے آ رہے ہیں، یہ صنعت مراعات النظیر کی ایک اور خوب صورت مثال ہے کہ انوار اور نفحات دونوں لطافت کے قبیلے سے ہیں، دونوں نور اور خوشبو کی دنیا کے سفیر ہیں، دونوں استقبال کے آداب جانتے ہیں اور دونوں محبوب کے قدموں میں اپنے تحفے رکھنا چاہتے ہیں۔

یہاں ہنستے آتے انوار کا تصور ہمیں اس آسمانی خوشی کی طرف لے جاتا ہے جو مسرت کی انتہا پر پہنچ کر مسکراہٹ میں ڈھل جاتی ہے، یہ مسکراہٹ کسی ایک زاویے کی نہیں بلکہ پوری کائنات کی ہے، یہ مسکراہٹ اس بات کی علامت ہے کہ آج رحمت کا دروازہ پوری طرح کھل گیا ہے، آج کرم کی نہریں پوری آب و تاب سے بہہ رہی ہیں، آج قرب کی ساعت اپنے تمام رنگوں کے ساتھ جلوہ گر ہے اور نفحات کا اٹھنا اس بات کا اعلان ہے کہ آج فضا میں وہ خوشبو رچی بسی ہے جو عام دنوں میں نصیب نہیں ہوتی، آج نسیم بھی اپنے دامن میں کچھ اور ہی طرح کی مہک بھر لائی ہے، آج ہوا بھی معطر ہو کر چل رہی ہے۔

یہ شعر معراج کی ساعت کو محض ایک واقعہ نہیں رہنے دیتا بلکہ اسے ایک کائناتی جشن بنا دیتا ہے، یہاں فلک بھی باراتی ہے، زمیں بھی مہمان، نور بھی میزبان ہے، خوشبو بھی ساقی، ہر طرف سے استقبال کے ترانے گونج رہے ہیں، ہر سمت سے مبارک باد کے نعرے بلند ہو رہے ہیں، یہ وہ لمحہ ہے جس میں زمان و مکان بھی اپنی حدیں بھول جاتے ہیں اور ایک ہی دائرے میں گھومنے لگتے ہیں، شاعر کی فکر کی وسعت یہاں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہے کہ اس نے ایک واقعے کو پوری کائنات کا مسئلہ بنا دیا ہے، ایک ساعت کو ابدیت کا عنوان دے دیا ہے، ایک رات کو دو جہانوں کی صبح بنا دیا ہے۔

بلاغت کی سطح پر یہ شعر اپنے اندر وہ شفافیت رکھتا ہے جو قاری کو معنی کے دریا میں اتار دیتی ہے، یہاں ایجاز بھی ہے اور اطناب بھی، چند لفظوں میں ایک وسیع منظر کھینچ دیا گیا ہے، ایک مختصر مصرع میں ایک طویل داستان سمٹ آئی ہے، یہ حسن ترکیب کا وہ نمونہ ہے جس میں لفظوں کی ترتیب بھی معنی کی خادمہ ہے اور صوت کی خادمہ بھی، رچی تھی شادی مچی تھی دھومیں، اس جملے میں تکرار کی صنعت بھی جھلکتی ہے اور سجع کی لطیف سی لہر بھی، تھی اور تھی کی تکرار ایک طرف خوشی کی ہمہ گیری کو اجاگر کرتی ہے تو دوسری طرف کلام کو ایک ردھم عطا کرتی ہے جو پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتا ہے۔

فکری سطح پر یہ شعر اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ معراج کا واقعہ صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس تک محدود نہیں بلکہ اس کی بازگشت پوری کائنات میں سنائی دیتی ہے، یہ وہ لمحہ ہے جس میں بندے کی معراج دراصل پوری انسانیت کی معراج بن جاتی ہے، یہ وہ ساعت ہے جس میں رب اور عبد کے بیچ قرب کی وہ مسافت طے ہوتی ہے جس کا اثر آسمانوں سے زمین تک پھیل جاتا ہے، اس لیے فلک بھی خوش ہے اور زمیں بھی، نور بھی مسکرا رہا ہے اور خوشبو بھی دوڑ رہی ہے۔

یہاں امام نے صنعت تلمیح کی ہلکی سی چھاپ بھی رکھی ہے کہ معراج کی طرف اشارہ خود ایک پوری تاریخ کو دعوت فکر دیتا ہے، وہ رات جس میں مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے سدرۃ المنتہیٰ تک کا سفر ہوا، وہ رات جس میں جبریل بھی پیچھے رہ گئے اور مصطفیٰ آگے بڑھ گئے، وہ رات جس میں رب نے اپنے محبوب کو وہ قرب عطا کیا جو کسی اور کے حصے میں نہ آیا، اس رات کی خوشی اگر فلک پر رچی اور زمین پر دھوم بن کر نہ چھلکے تو پھر کہاں چھلکے۔

جمالیاتی سطح پر یہ شعر قاری کے دل میں ایک ایسی تصویر بساتا ہے جو دیر تک مٹتی نہیں، ایک طرف آسمان کی نیلاہٹ پر سرخی کی جھلک، دوسری طرف زمین کی گود میں قہقہوں کی گونج، ایک طرف نور کی مسکراتی کرنیں، دوسری طرف خوشبو کے دوڑتے جھونکے، یہ منظر نگاری اپنے اندر وہ دلکشی رکھتی ہے جو آنکھوں کو بھی محظوظ کرتی ہے اور دل کو بھی، یہ وہ پیکر تراشی ہے جس میں الفاظ رنگ بن جاتے ہیں اور مصرعے کینوس، اور شاعر ایک مصور کی طرح اپنی تخیل کی برش سے معراج کی رات کا نقشہ کھینچ دیتا ہے۔

یہاں حسن ادا کا وہ جلوہ ہے جو سادگی میں وقار پیدا کرتا ہے، کوئی ثقالت نہیں، کوئی تصنع نہیں، سب کچھ ایسے بہہ رہا ہے جیسے دریا اپنی موجوں کے ساتھ بہتا ہے، سلاست اور روانی اس شعر کی روح میں رچی ہوئی ہیں، پڑھنے والا ایک سانس میں مصرعے پڑھ جاتا ہے اور محسوس کرتا ہے کہ جیسے کوئی خوشبو دار ہوا کا جھونکا اس کے دل کے دریچوں سے گزر گیا ہو، یہی شیوائی ہے، یہی حلاوت بیان، یہی وہ خوش کلامی ہے جو کلام کو یادگار بنا دیتی ہے۔

معنوی سطح پر یہ شعر ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ حقیقی خوشی وہ ہے جو رب کی رضا سے جڑی ہو، وہ خوشی جو محبوب خدا کے قرب سے وابستہ ہو، ایسی خوشی میں صرف انسان نہیں بلکہ کائنات بھی شریک ہوتی ہے، پہاڑ بھی جھومتے ہیں، دریا بھی گنگناتے ہیں، ستارے بھی مسکراتے ہیں، ہوائیں بھی مہکتی ہیں، یہ کائناتی شعور کی وہ جھلک ہے جو شاعر کی بصیرت سے پھوٹتی ہے اور قاری کے دل میں اتر جاتی ہے۔

یہاں صنعت حسن توجیہ بھی اپنے حسن کے ساتھ موجود ہے کہ انوار کا ہنستے آنا اور نفحات کا اٹھنا محض تشبیہی پیکر نہیں بلکہ اس حقیقت کی علامت ہے کہ رحمت کے دروازے کھل گئے ہیں اور برکت کی نہریں بہنے لگی ہیں، یہ وہ ساعت ہے جس میں آسمان کے خزانے زمین کے دامن میں انڈیلے جا رہے ہیں، یہ وہ لمحہ ہے جس میں دعا کی قبولیت بھی مسکرا رہی ہے اور امید کی شمعیں بھی جل رہی ہیں۔

امام کی فکری گہرائی یہاں اس بات میں بھی جھلکتی ہے کہ انھوں نے معراج کو محض ایک تاریخی واقعہ نہیں بنایا بلکہ ایک زندہ تجربہ بنا دیا ہے، ایسا تجربہ جسے قاری پڑھتے ہوئے محسوس کر سکتا ہے، دیکھ سکتا ہے، سونگھ سکتا ہے، سن سکتا ہے، یہ ہمہ حسی تاثر اس شعر کو محض کلام نہیں رہنے دیتا بلکہ ایک کیفیت بنا دیتا ہے، وہ کیفیت جو دل میں اتر کر دیر تک ٹھہری رہتی ہے۔

یہ شعر اپنی ترکیب میں بھی ایک خاص توازن رکھتا ہے، پہلے مصرع میں فلک اور زمیں، دوسرے میں انوار اور نفحات، دونوں مصرعوں میں دو دو عناصر، دونوں میں حرکت، دونوں میں خوشی، دونوں میں استقبال، یہ حسن ترتیب قاری کے ذہن میں ایک ہم آہنگی پیدا کرتا ہے اور شعر کو ایک مکمل وحدت عطا کرتا ہے، یہی وحدت موضوع ہے، یہی وحدت خیال، یہی وحدت تاثر۔

اگر ہم اس شعر کو رمزیت کے زاویے سے دیکھیں تو فلک اور زمیں محض مقامات نہیں بلکہ دو سطحیں ہیں، ایک عالم بالا کی سطح، ایک عالم اسفل کی سطح، اور معراج وہ پل ہے جو دونوں کو جوڑتا ہے، انوار اور نفحات محض نور اور خوشبو نہیں بلکہ رب کی قربت کے دو استعارے ہیں، ایک بصارت کا، ایک بصیرت کا، ایک آنکھ کی تسکین، ایک دل کی راحت، اور جب یہ دونوں ملتے ہیں تو انسان کے وجود میں وہ سرور پیدا ہوتا ہے جسے لفظوں میں سمیٹنا آسان نہیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں امام کی ندرت جلوہ گر ہوتی ہے، انھوں نے خوشی کو روایتی استعاروں میں قید نہیں کیا بلکہ اسے فلک کی شادی اور زمیں کی دھوم میں بنادیا، نور کو مسکراتا ہوا مہمان بنایا اور خوشبو کو دوڑتا ہوا قاصد، یہ تخلیقی جرأت اس شعر کو عام کلام سے ممتاز کر دیتی ہے اور اسے انفرادیت کا تاج پہنا دیتی ہے۔

آخر میں یہ شعر ہمیں یہ بھی یاد دلاتا ہے کہ معراج کا پیغام آج بھی زندہ ہے، آج بھی اگر دل کو پاک کیا جائے، نیت کو صاف کیا جائے، عشق کو رہبر بنایا جائے تو فلک پر رچی اور زمیں پر مچی کا وہی منظر دل کے آئینے میں دیکھا جا سکتا ہے، آج بھی انوار مسکرا کر استقبال کو آسکتے ہیں اور نفحات دوڑ کر سینے سے لگ سکتے ہیں، شرط یہ ہے کہ نگاہ میں طلب ہو اور دل میں شوق، یہی اس شعر کا مقصود ہے، یہی اس کا مدعا، یہی اس کا منشا۔

یوں یہ شعر محض دو مصرعوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک کائناتی نغمہ ہے، ایک آسمانی ترانہ ہے، ایک زمینی جشن ہے، ایک نورانی مسکراہٹ ہے اور ایک خوشبودار سانس، اس میں فصاحت کی آب ہے، بلاغت کی روشنی ہے، سلاست کی ہوا ہے، شگفتگی کی خوشبو ہے، لطافت کی نمی ہے، شفافیت کی چمک ہے، دلکشی کی کشش ہے، حلاوت بیان کی مٹھاس ہے، شیوائی کی نرمی ہے، نفاست کی نزاکت ہے، نزاکت لفظ کی رعنائی ہے، صفائی اسلوب کی پاکیزگی ہے، حسن ادا کی دلربائی ہے، حسن انتخاب کی دانائی ہے، حسن ترتیب کی ہم آہنگی ہے، حسن ترکیب کی مہارت ہے، خوش بیانی کی روانی ہے، خوش اسلوبی کا وقار ہے، خوش کلامی کی تاثیر ہے، شائستگی کی تہذیب ہے، وقار بیان کی سنجیدگی ہے، تہذیب زبان کی پاکیزگی ہے، متانت کی مضبوطی ہے، سنجیدگی کا ٹھہراؤ ہے، وقار کی آن ہے، تمکنت کی شان ہے، ٹھہراؤ کی گہرائی ہے، نرمی کی مٹھاس ہے، گرمی کی تپش ہے، بانکپن کی چمک ہے، روانی خیال کی موج ہے۔

اور یوں یہ شعر معراج کے آسمان پر ایک ایسا ستارہ بن کر چمکتا ہے جو نہ صرف اپنے دور کو روشن کرتا ہے بلکہ آنے والے زمانوں کی آنکھوں کو بھی خیرہ کرتا رہے گا، کیوں کہ یہ محض لفظوں کا ہنر نہیں بلکہ دل کی آگ ہے، محض صنعتوں کا جال نہیں بلکہ عشق کی اڑان ہے، محض معنی کی بازی گری نہیں بلکہ حقیقت کی جھلک ہے، اور یہی وہ راز ہے جو اس شعر کو امر کر دیتا ہے۔



گھر ایک عورت کی سلطنت یا قید خانہ؟

از: سلمٰی شاہین امجدی

گوشۂ خواتین

ہر دور میں یہ سوال اٹھایا جاتا رہا ہے کہ عورت کا گھر سے رشتہ کیا ہے؟ کیا یہ اس کی طاقت کا مرکز ہے یا اس کی آزادی کی قید؟ مغربی فکر نے اس سوال کا جواب ایک خاص رخ پر دیا اور گھر کو عورت کے لیے پنجرے کے طور پر پیش کیا۔ جب کہ اسلام نے صدیوں پہلے اس مسئلے کو بڑی حکمت اور گہرائی سے حل کر دیا تھا۔

آج جب ہم جدید دنیا میں عورت کی حیثیت پر غور کرتے ہیں تو ہمیں اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس موضوع کا تحقیقی اور معروضی جائزہ لینا ہوگا۔ نہ محض جذباتی انداز میں، بلکہ قرآن و حدیث، فقہی ورثے اور عقلی دلائل کی بنیاد پر۔

یہ بحث محض نظریاتی نہیں، عملی بھی ہے۔ آج کی مسلمان خاتون دو متضاد آوازوں کے درمیان کھڑی ہے۔ ایک طرف مغربی میڈیا اسے گھر سے نکلنے پر اکسا رہا ہے، دوسری طرف بعض روایت پسند حلقے اسے ایسی بندشوں میں جکڑ رہے ہیں جن کی اسلام میں کوئی بنیاد نہیں۔ اس الجھن کا حل صرف قرآن و سنت کی طرف رجوع میں ہے۔

گھر اسلامی تصور میں

اسلام میں گھر کو محض چار دیواری نہیں کہا گیا۔ قرآنِ مجید نے گھر کے لیے لفظ قرار استعمال کیا ہے جس کے معنی ہیں ٹھہراؤ، سکون اور استقرار۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَ لَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰى وَ اَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَ اَطِعْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗؕ اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَیْتِ وَ یُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ۚ (الاحزاب:33)

ترجمہ: اور اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور بے پردہ نہ رہو جیسے اگلی جاہلیت کی بے پردگی اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور اللہ اور اس کے رسول کا حکم مانو اللہ تو یہی چاہتا ہے اے نبی کے گھر والو کہ تم سے ہر ناپاکی دور فرمادے اور تمہیں پاک کر کے خوب ستھرا کر دے۔ اور اپنے گھروں میں وقار کے ساتھ ٹھہری رہو۔

اس آیتِ کریمہ میں قرار کا مادہ ہے جو وقار، اطمینان اور مرکزیت کا مفہوم دیتا ہے۔ یعنی گھر عورت کا مرکز ہے، اس کی کمزوری کا اظہار نہیں۔ جس طرح دل سینے میں رہ کر پورے جسم کو زندگی دیتا ہے، اسی طرح عورت گھر میں رہ کر پورے خاندان اور معاشرے کو توانائی دیتی ہے۔ قرآنِ کریم میں ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَ مِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَیْهَا وَ جَعَلَ بَیْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةًؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (الروم: 21)

ترجمہ: اور اس کی نشانیوں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہاری ہی جنس سے جوڑے بنائے کہ اُن سے آرام پاؤ اور تمہارے آپس میں محبت اور رحمت رکھی بے شک اس میں نشانیاں ہیں دھیان کرنے والوں کے لئے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ گھر کی بنیاد محبت اور رحمت پر ہے، نہ زور اور جبر پر۔ عورت اس گھر میں سکون کا ذریعہ ہے، قیدی نہیں۔ اسلامی تصور میں گھر ایک مقدس ادارہ ہے جس کی تعمیر میں مرد اور عورت دونوں برابر کے شریک ہیں۔ ہر ایک اپنے دائرے میں۔ اس لیے گھر کو آباد رکھنا، اولاد کی پرورش کرنا اور شوہر کی امانت کی حفاظت کرنا۔ یہ سب عبادات میں شمار ہوتے ہیں۔ یعنی گھر داری محض ایک سماجی کردار نہیں، بلکہ اللہ کے حضور میں ایک عبادت ہے جس کا اجر آخرت میں ملے گا۔

مغرب کا غلط فریم: قید خانے کا تصور کہاں سے آیا؟

انیسویں صدی کے یورپ میں خواتین واقعی مظلوم تھیں۔ انہیں میراث، تعلیم، ووٹ اور قانونی حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ اس ماحول میں فیمنسٹ تحریک نے جنم لیا اور گھر کو قید سے تعبیر کیا۔ لیکن یہ غلطی یورپ کے مردنے کی تھی۔ اسلام نے نہیں۔ سیمون دی بوونے اپنی کتاب The Second Sex میں لکھا کہ گھریلو عورت ایک محکوم مخلوق ہے۔ بٹی فریڈن نے The Feminine Mystique میں گھر کو comfortable concentration camp یعنی آرام دہ حراستی کیمپ کہا۔ یہ تعبیرات یورپ کے تجربے سے نکلی تھیں اور ان کا اسلامی نظامِ حیات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن مسلمان خواتین میں بھی یہ خیالات پھیلائے گئے۔

بٹی بچاؤ تحریک، میراث کا حق، گواہی کا حق، نکاح میں رضامندی، خلع کا اختیار، مہر کی ضمانت یہ سب حقوق اسلام نے آج سے چودہ سو سال پہلے عطا کر دیے تھے جب یورپ کی عورت تاریکی میں تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: خَيْرُكُمْ خَيْرُكُمْ لِأَهْلِهِ، وَأَنَا خَيْرُكُمْ لِأَهْلِي (ترمذی: 3895)

تم میں سے بہترین وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے لیے بہترین ہو، اور میں اپنے گھر والوں کے لیے تم سب سے بہتر ہوں۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام میں گھر کو قید نہیں بلکہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہاں مرد کو بھی حکم دیا گیا کہ اپنے گھر والوں کے لیے بہتر بنو۔ یعنی گھر ایک دو طرفہ ذمہ داری ہے، نہ کہ صرف عورت کی محکومیت۔

تاریخ کی ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ عرب میں قبلِ اسلام عورت کو کوئی حق حاصل نہ تھا، بیٹیوں کو زندہ دفن کیا جاتا تھا۔ اسلام نے آکر اس جاہلانہ رسم کو ختم کیا اور عورت کو وہ مقام دیا جو کسی اور تہذیب نے نہیں دیا۔ قرآن میں ارشاد ہے: وَإِذَا الْمَوْءُودَةُ سُئِلَتْ (التکویر: 8) ترجمہ: اور جب اس زندہ دفن کی گئی بچی سے پوچھا جائے گا۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلام نے بچی کے قتل کو قیامت میں جواب دہی کا معاملہ قرار دیا۔

گھر عورت کی سلطنت کیسے؟

حضرت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہا جو سید الانبیاء ﷺ کی لختِ جگر ہیں۔ ان کا گھر پوری امت کے لیے مثال ہے۔ وہ گھر کی ملکہ تھیں۔ چکی پیستیں، بچوں کی تربیت کرتیں، شوہر کی معاون ہوتیں اور اس کے ساتھ ساتھ علم و فضل، تقویٰ و طہارت اور اخلاقِ عالیہ میں بلند منزلت پر فائز تھیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ ان کی آمد پر احتراماً کھڑے ہو جاتے اور نہایت محبت و شفقت سے ان کا استقبال فرماتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ اور سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا کے درمیان گھر کے کام تقسیم تھے۔ باہر کا کام حضرت علی کے ذمے اور اندر کا کام سیدہ فاطمہ کے ذمے۔ سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے ایک مرتبہ خادم مانگنے کے لیے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کی تو آپ ﷺ نے ان کے ہاتھ کے چھالے دیکھے اور فرمایا: کیا میں تمہیں اس سے بہتر چیز نہ بتاؤں؟ سونے سے پہلے تینتیس تینتیس بار سبحان اللہ، الحمدللہ اور چونتیس بار اللہ اکبر پڑھو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ گھریلو محنت کتنی مبارک ہے کہ حضور ﷺ نے اسے تسبیحات سے جوڑ دیا۔

سیدہ فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کی والدہ ماجدہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا تجارت پیشہ تھیں، مال دار تھیں، لیکن جب حلقہ بگوش اسلام ہوئیں تو انہوں نے اپنی ساری دولت دین کی خدمت میں لگا دی۔ گھر ان کا پنجرہ نہیں تھا، ان کی طاقت کا مخزن تھا۔ یہ وہی گھر تھا کہ جب حضور ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی تھی تو آپ وحی لے کر اسی گھر میں آئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ایک عظیم اور مخلص شریک حیات کا ثبوت دیتے ہوئے آپ کی دل جوئی فرمائی اور آپ کو تسلی دی یوں وہ گھر صرف ایک مکان نہ رہا بلکہ رسول اللہ ﷺ کے لیے محبت، سکون اطمینان اور اعتماد کا گہوارہ بن گیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ہزاروں احادیث روایت کیں، فقہی مسائل بیان کیے، صحابہ کرام کے سوالات کے جوابات دیے۔ سب کچھ گھر سے، پردے میں رہ کر۔ امام زہری رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا علم تمام صحابہ کے مجموعی علم سے زیادہ تھا۔ کیا یہ قید خانہ تھا؟ یا وہ مرکز تھا جہاں سے نور پھوٹتا تھا؟

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اداس اور پریشان تھے تو سیاسی مشورہ دیا اور صورتِ حال سنبھال لی۔ یہ مشورہ گھر کے اندر سے آیا اور امت کی تاریخ بدل گئی۔

جدید تحقیق کیا کہتی ہے؟

آج کی سماجیاتی تحقیقات بھی اس بات کی تصدیق کرتی ہیں کہ گھر میں ماں کی موجودگی بچوں کی ذہنی، جذباتی اور اخلاقی نشوونما پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کے مطالعوں کے مطابق وہ بچے جن کی مائیں گھر میں رہتی ہیں ان میں ڈپریشن اور نفسیاتی امراض کی شرح نسبتاً کم ہوتی ہے۔

ماہرِ نفسیات جان بولبی نے Attachment Theory میں ثابت کیا کہ بچے کی ابتدائی سالوں میں ماں کی قربت اس کی پوری زندگی کی شخصیت کو متاثر کرتی ہے۔ ماں کی غیر موجودگی بچے میں عدم تحفظ، بے اعتمادی، اضطراب اور ذہنی عدم توازن پیدا کر سکتی ہے۔ یہ وہی بات ہے جو اسلام نے ماں کی قدر و منزلت کے حوالے سے صدیوں پہلے کہی تھی۔

دوسری طرف مغرب میں جہاں عورت کو آزادی کے نام پر گھر سے نکالا گیا، وہاں طلاق کی شرح ساٹھ فیصد سے تجاوز کر چکی ہے، بچوں کے مسائل بڑھ رہے ہیں اور خواتین میں اکیلے پن کا بحران شدید ہو رہا ہے۔ امریکہ میں تنہائی کو اب باقاعدہ ایک وبا قرار دیا جا چکا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ خاندانی نظام کا ٹوٹنا ہے۔

کیوں کہ کوئی بھی تہذیب اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی جب تک اس کا خاندانی نظام مضبوط نہ ہو۔ اور خاندانی نظام کی محور ہمیشہ سے عورت رہی ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا تھا: مجھے ایک اچھی ماں دو، میں تمہیں ایک بہترین قوم دے دوں گا۔

یہ جملہ اسلامی فلسفے کی تصدیق ہے۔ گھر میں عورت قید نہیں، بلکہ قوم کی معمار ہے۔ گھر وہ یونیورسٹی ہے جہاں صالح نسل تیار ہوتی ہے، وہ خانقاہ ہے جہاں اخلاق کی تعلیم ملتی ہے اور وہ قلعہ ہے جہاں اقدار محفوظ رہتے ہیں۔

گھر قید کب بنتا ہے؟

اسلام نے گھر کو سلطنت کہا لیکن کچھ لوگوں نے اسے واقعی قید خانہ بنا دیا۔ جب عورت کو تعلیم سے روکا جائے، اس کی رائے کو اہمیت نہ دی جائے، اس کے جائز حقوق، مہر، نفقہ وغیرہ غصب کیے جائیں۔ تو یہ اسلام نہیں، یہ مردوں کی کمزوری ہے جو دین کے نام پر ڈھانپی جاتی ہے۔

افسوس کہ ہمارے بعض معاشروں میں عورت کو اسلامی حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے اور اسے دین کا نام دیا جاتا ہے۔ لڑکی کو پڑھنے نہیں دیتے حالاں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ (ابن ماجہ:224)

ترجمہ: علم حاصل کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔

اس فرض میں مسلمان عورت بھی شامل ہے۔

پردہ قید نہیں

حضور ﷺ نے خواتین کو تبلیغ فرمائی، صحابیات نے میدانِ جہاد میں زخمیوں کی تیمارداری کی۔ پردہ حجاب ہے قید نہیں۔

اسلامی گھر وہ ہے جہاں شوہر قوّام ہو۔ یعنی قوامیت ذمہ داری ہے، نہ آمریت۔ قرآن نے کہا:

وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ (النساء: ١٩)

ترجمہ: اور ان کے ساتھ بھلائی کے ساتھ زندگی گزارو۔

جہاں مشورہ ہو، محبت ہو، احترام ہو۔ جہاں عورت کی آواز سنی جائے، اس کی ضرورت پوری کی جائے اور اسے علم و ایمان میں ترقی کا موقع دیا جائے۔

حضور ﷺ کا طرزِ عمل دیکھیں! آپ ﷺ گھر کے کام میں مدد کرتے، ازواج سے مشورہ لیتے، ان کی رائے کا احترام کرتے۔ یہی اسلامی گھر کا ماڈل ہے۔ جہاں مرد اور عورت مل کر ایک خوب صورت زندگی بناتے ہیں۔

عورت کی گھریلو خدمت بے قدری یا عبادت؟

مغرب نے گھریلو کام کو unpaid labour یعنی بلا معاوضہ مزدوری کہہ کر اسے ذلت کی نگاہ سے دیکھا جبکہ اسلام نے اسے عبادت کا درجہ دیا۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھریلو کام کو جب حضور ﷺ نے دیکھا تو انہیں تسبیحات سکھائیں۔ یہ اشارہ تھا کہ یہ کام ذکرِ الٰہی کے ساتھ کرو تو عبادت بن جاتا ہے۔

کیوں کہ جب عورت اپنے شوہر کی خدمت کرتی ہے اور گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے تو یہ اس کی ذمہ داری نہیں بلکہ اس کی طرف سے صدقہ ہے۔ یہ فقہی موقف عورت کی گھریلو خدمت کو احسان کا درجہ دیتا ہے۔

آج کی مسلمان خاتون کے لیے راستہ

آج کی مسلمان خاتون کو نہ مغرب کے فریب میں آنا ہے نہ مشرق کی جہالت کا شکار ہونا ہے۔ اسے اسلام کی روشنی میں اپنا راستہ تلاش کرنا ہے۔ نہ وہ راستہ جو فیمنزم دکھاتا ہے اور نہ وہ جو قبائلی رسوم و رواج تجویز کرتے ہیں۔

گھر سنبھالنا عبادت ہے۔ لیکن گھر کی آڑ میں ظلم سہنا فریضہ نہیں۔ تعلیم حاصل کرنا فرض ہے۔ لیکن تعلیم کو خاندان سے فرار کا ذریعہ نہیں بنانا۔ کمانا جائز ہے۔ لیکن گھر کی بنیاد کو قربان کر کے نہیں۔ سماج میں کردار ادا کرنا نیکی ہے۔ لیکن اولاد کو لاوارث چھوڑ کر نہیں۔

حضور ﷺ کی ازواجِ مطہرات نے دین پڑھایا، تجارت کی، سیاسی معاملات پر رائے دی اور گھر بھی بخوبی چلایا۔ یہی اسلامی خاتون کا ماڈل ہے۔ ان کی زندگی میں گھر اور دنیا الگ نہیں تھے۔ دونوں مل کر ایک مکمل اسلامی زندگی بناتے تھے۔ آج کی مسلمان خاتون کو چاہیے کہ وہ اپنے گھر کو علم کا گہوارہ بنائے، اپنی اولاد کو دین کی تعلیم دے، اپنے شوہر کی رفیق رہے اور ساتھ ساتھ خود بھی علمی، دینی اور سماجی ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔ یہی وہ توازن ہے جو اسلام نے عطا کیا ہے اور یہی وہ راستہ ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں کامیابی کا ضامن ہے۔

گھر عورت کے لیے نہ قید خانہ ہے نہ محض چار دیواری۔ یہ وہ مرکز ہے جہاں سے انسانیت کی اصل تعمیر ہوتی ہے۔ ایک پڑھی لکھی، باہمت، باحیا اور باایمان ماں کا گھر وہ یونیورسٹی ہے جہاں قومیں بنتی ہیں، وہ خانقاہ ہے جہاں روحیں تراشی جاتی ہیں، وہ قلعہ ہے جہاں اقدار محفوظ رہتے ہیں۔

اسلام نے عورت کو گھر دے کر اسے محدود نہیں کیا۔ بلکہ اسے وہ مقام دیا جہاں سے وہ دنیا کو بدل سکتی ہے۔

بشرطیکہ وہ خود اپنی عظمت کو پہچانے اور اسلام کی روشنی میں اپنا کردار ادا کرے۔ جو عورت اپنے گھر کو عبادت گاہ بنالے، اپنی اولاد کو دین کا سپاہی بنائے اور اپنے گھر کو جنت کا ٹکڑا بنادے، وہ نہ صرف اپنی آخرت سنوارتی ہے بلکہ پوری امت کے مستقبل کی مضبوط بنیاد بھی رکھتی ہے۔ گھر عورت کا پنجرہ نہیں، بلکہ اس کا تاج ہے۔ وہ اسے عزت کے ساتھ پہننے کی مستحق ہے، اور اہلِ خانہ پر بھی لازم ہے کہ وہ اس کے اس مقام اور وقار کا احترام کریں۔



ننھّا چوزہ

از: ڈاکٹر محمد حسین مشاہد رضوی

بچوں کی دنیا

شبّو مرغی بڑے جتن سے اپنا ایک انڈہ بچا پائی تھی۔ کیوں کہ اُس کے سارے انڈے ناشتے میں کھا لیے گئے تھے۔ بے چاری شبّو اُسے لے کر ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ بیس بائیس دن کی لمبی محنت کے بعد انڈے کا چھلکا توڑ کر چوزہ باہر آ گیا۔ شبّو کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔

چوزہ تھا بڑا چنچل اور شریر۔ شبّو دانہ چگنے جب باہر جانے لگی تو اس نے چوزے کو نصیحت کی کہ یہاں سے ہٹنا نہیں۔ ماں جب باہر چلی گئی تو چوزہ گھر کا معاینہ کرنے لگا۔ اُسے سامنے چوہے کی بِل دکھائی دی۔ چوہا ابھی ابھی گھوم پھِر کر واپس آیا تھا۔ اُس نے چوزے کو دیکھا تو للچا اُٹھا، اور دل ہی دل میں کہنے لگا:

”ہاے! اتنا پیارا چوزہ!“ اس کے من میں کھوٹ آ گیا وہ سوچنے لگا، کاش! اس کے نرم و ملائم اور ریشمی پر مِل جائیں تو میں اپنا گدّا بنا کر سکون کی نیند سو سکوں۔

وہ چوزے سے بول اُٹھا: ”پیارے چوزے مجھ سے دوستی کرو گے؟“

”ہاں! ہاں!“ چوزہ کہہ اُٹھا اور حیرت سے پوچھا: ”کیا تم مجھے اپنا دوست بناؤ گے؟“

”کیوں نہیں!“ چوہے نے جھٹ سے جواب دیا اور کہا کہ: ”میں تمھیں دُنیا کی سیر کراؤں گا، مالکن کے کچن روم میں لے جا کر اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا۔“

”سچ مچ!“ چوزہ چہک اُٹھا۔ اور چوہے کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا۔ چوہا ترکیب سوچنے لگا کہ کس طرح اِس کے پر کترے جائیں۔ سو اُس نے کہا: ”دوست! میرے گھر نہیں آؤ گے؟“

چوزے نے کہا: ’’کیوں نہیں ؟ دوستی کی ہے تو اُس کو نبھاؤں گا بھی۔ ‘‘ اتنا کہہ کر چوزہ چوہے کی بل میں گھسنے لگا، لیکن وہ اُس باریک سوراخ میں کہاں جاپاتا؟ اُس کی گردن اُس میں پھنس گئی۔ چوہا فوراً اس کے نرم و ملائم اور ریشمی پروں کو کترنے لگا۔ چوزہ بولا: ’’میرے دوست ! مجھے بہت درد ہو رہا ہے اور مجھ کو گھٹن محسوس ہو رہی ہے کہیں میرا دم نہ نکل جائے۔ ‘‘

’’میرے پیارے دوست ! تھوڑا اور ٹھہرو میں بل کا سوراخ بڑا کر رہا ہوں ‘‘ چوہے نے چالاکی سے کہا۔

تب ہی شبّو مرغی دانہ چُگ کر واپس آگئی، اپنے پیارے بچے کی گردن چوہے کی بل میں پھنسی دیکھ کر کراہ اُٹھی اور فوراً اس کو باہر کھینچ لیا۔ اسی جھٹکے میں چوزے کا پر کترنے میں مصروف چوہا بھی بل سے باہر آگیا۔ شبّو اس کے کرتوت کو سمجھ کر غصہ سے بپھر گئی۔ اس نے زور سے چوہے کو چونچ ماری کہ اس کی ہڈی پسلی ایک ہو گئی۔

چوزہ اپنی بگڑی ہوئی حالت دیکھ کر زور زور سے رونے لگا۔ کیوں کہ اس کی گردن کے پاس کے سارے پر صاف ہو گئے تھے۔

شبّو نے بڑے لاڈ سے اس کو کہا: ’’کوئی بات نہیں میرے لعل یہ بچپن کے پر ہیں کچھ دنوں کے بعد تمہارے دوسرے پر اُگ آئیں گے ‘‘۔ اور پھر سمجھایا کہ ’’تمہیں میری نصیحت یاد رکھنی چاہیے تھی نا...... ‘‘!

’’ہاں ! امّی جان ! ‘‘ چوزہ بہت شرمندہ ہوا۔



اتباعِ سنتِ نبوی ﷺ

از: غلام محی الدین نوری، متعلم دارالعلوم قادریہ

جہانِ علم

طلبہ وطالبات کی علمی، ادبی اور فکری صلاحیتوں کو نکھارنے اور اجاگر کرنے کے لیے مخصوص کالم

اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ہدایت کے لیے انبیائے کرام علیہم السلام کو مبعوث فرمایا اور حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو خاتم النبیین بنا کر قیامت تک کے لیے کامل اور جامع شریعت عطا فرمائی۔ آپ ﷺ کی ذاتِ اقدس قرآنِ کریم کی عملی تفسیر، اخلاقِ حسنہ کا اعلیٰ نمونہ اور انسانی زندگی کے ہر شعبے میں بہترین اسوہ ہے۔ اسی لیے اسلام نے محض آپ ﷺ سے محبت ہی کا حکم نہیں دیا بلکہ آپ کی سنت کی پیروی کو ایمان کی تکمیل، اللہ تعالیٰ کی محبت کے حصول اور دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

قرآنِ کریم میں اتباعِ سنت کی اہمیت

قرآنِ مجید نے متعدد مقامات پر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ اللهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ﴾ (آل عمران:31)

آپ فرما دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہارے گناہ بخش دے گا۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:21)

یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔

ان آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا، محبت اور کامیابی کا راستہ اتباعِ رسول ﷺ ہی ہے۔

احادیث نبوی میں اتباع سنت

رسول اللہ ﷺ نے سنت کی پابندی کی تاکید کرتے ہوئے فرمایا:

مَنْ أَطَاعَنِي فَقَدْ أَطَاعَ اللهَ، وَمَنْ عَصَانِي فَقَدْ عَصَى اللهَ

جس نے میری اطاعت کی، اس نے اللہ کی اطاعت کی، اور جس نے میری نافرمانی کی، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔

ایک اور حدیث میں فرمایا: "عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ"

تم پر لازم ہے کہ میری سنت اور میرے ہدایت یافتہ خلفائے راشدین کی سنت کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔

یہ احادیث اس حقیقت کو آشکار کرتی ہیں کہ سنت نبوی اسلام کالازمی جز اور نجات کاراستہ ہے۔

موجودہ دور میں سنت کی ضرورت

آج کا دور فکری انتشار، اخلاقی انحطاط، مادہ پرستی اور بے سکونی کا دور ہے۔ انسان جدید سہولیات کے باوجود ذہنی اضطراب اور روحانی خلا کا شکار ہے۔ ان تمام مسائل کا حقیقی علاج رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات اور سنتِ مبارکہ میں موجود ہے۔ اگر مسلمان اپنی انفرادی، خاندانی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی زندگی کو سنتِ نبوی کے مطابق ڈھال لیں تو ان کے بیشتر مسائل خود بخود حل ہوسکتے ہیں۔ اتباع سنت کا تقاضا صرف ظاہری شعائر تک محدود نہیں بلکہ عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، تجارت، عدل وانصاف، رحم وکرم، حسنِ سلوک اور انسانی حقوق سمیت زندگی کے ہر شعبے میں رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کو اپنانا ہے۔ اسی طرح سنت کا علم حاصل کرنا، اسے دوسروں تک پہنچانا، اپنی اولاد کی تربیت سنت کے مطابق کرنا اور معاشرے میں سنت کے فروغ کے لیے عملی کردار ادا کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں



فضائل یوم جمعہ

از: حافظہ آشنا پروین غوثی، المعہد الغوثی للبنات

جہان علم

اللہ رب العزت نے جس طرح سال کے بارہ مہینوں میں رمضان المبارک کو عظمت، رحمت اور برکت کا مہینہ بنایا ہے، اسی طرح ہفتے کے سات دنوں میں جمعہ کو سب سے زیادہ فضیلت اور شرف عطا فرمایا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ احادیثِ مبارکہ میں اسے "سیدُ الأیام"، یعنی تمام دنوں کا سردار، قرار دیا گیا ہے۔ یہ دن اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت عظیم ہے اور اہلِ ایمان کے لیے ایک ہفتہ وار عید کی حیثیت رکھتا ہے۔

جمعہ کی رات بابرکت رات ہے اور اس کا دن نور، رحمت اور مغفرت کا دن ہے۔ یہ دن اپنے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بے شمار رحمتیں اور برکتیں لے کر آتا ہے، تاکہ بندۂ مومن ان سے بھرپور فیض حاصل کرے۔ احادیثِ مبارکہ میں بیان ہوا ہے کہ جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت آتی ہے کہ اگر کوئی مسلمان اخلاص کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو اللہ تعالیٰ اس کی دعا قبول فرماتا ہے، بشرطیکہ وہ کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعا نہ کرے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اچھی طرح وضو کرے، سکون و وقار کے ساتھ نمازِ جمعہ کے لیے آئے، خطبہ غور سے سنے اور دورانِ خطبہ خاموش رہے، اس کے اس جمعہ سے گزشتہ جمعہ تک کے صغیرہ گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔

جمعہ کی فضیلت کے متعلق متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، تاکہ اہل ایمان کے دلوں میں اس دن کی عظمت جاگزیں ہو اور وہ نماز جمعہ اور اس کی عبادات کی اہمیت کو سمجھ سکیں۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوا جمعہ کا دن ہے، اسی دن آدم پیدا کیے گئے، اسی دن وہ زمین پر اتارے گئے، اسی دن ان کی توبہ قبول کی گئی، اسی دن ان کا انتقال ہوا، اور اسی دن قیامت برپا ہو گی، انس و جن کے علاوہ سبھی جاندار جمعہ کے دن قیامت برپا ہونے کے ڈر سے صبح سے سورج نکلنے تک کان لگائے رہتے ہیں، اس میں ایک ساعت (گھڑی) ایسی ہے کہ اگر کوئی مسلمان بندہ

نماز پڑھتے ہوئے اس گھڑی کو پالے، پھر اللہ تعالیٰ سے اپنی کسی ضرورت کا سوال کرے تو اللہ اس کو (ضرور) دے گا۔ "کعب الاحبار نے کہا: یہ ساعت (گھڑی) ہر سال میں کسی ایک دن ہوتی ہے تو میں نے کہا: نہیں بلکہ ہر جمعہ میں ہوتی ہے۔

(سنن ابو داؤد، حدیث 1046)

ابن ماجہ نے ابو لبابہ ابن عبد المنذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "ان یوم الجمعة سید الایام و اعظمها عند الله تعالیٰ"۔ یعنی بے شک جمعہ کا دن تمام دنوں کا سردار ہے اور اللہ تعالی کے نزدیک سب سے بڑا ہے۔ (سنن ابن ماجہ حدیث 1084)

جمعہ کے دن کی ایک اہم فضیلت یہ بھی ہے کہ اس دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کثرت سے درود شریف پڑھنے کی خصوصی ترغیب دی گئی ہے۔ حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: فَأَكْثِرُوا عَلَيَّ مِنَ الصَّلَاةِ فِيهِ، فَإِنَّ صَلَاتَكُمْ مَعْرُوضَةٌ عَلَيَّ۔ (سنن ابن ماجہ، الحدیث 1085)

یعنی جمعہ کے دن مجھ پر کثرت سے درود پڑھا کرو، کیونکہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔

اسی طرح جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کی بھی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: مَنْ قَرَأَ سُورَةَ الْكَهْفِ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ أَضَاءَ لَهُ مِنَ النُّورِ مَا بَيْنَهُ وَبَيْنَ الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (شعب الایمان)

جو شخص جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرے، تو اس شخص اور کعبہ شریف کے درمیان (فاصلے جتنا بڑا) نور اس شخص کے لیے پیدا کر دیا جاتا ہے۔

بزرگانِ دین نے بھی جمعہ کے دن صفائی، غسل، خوشبو لگانے، مسواک کرنے اور ناخن تراشنے کو مستحب اعمال میں شمار کیا ہے۔

جمعہ کا دن اللہ تعالیٰ کی عبادت، ذکر و اذکار، تلاوتِ قرآن، درودِ پاک، دعا اور نیک اعمال میں گزارنے کا دن ہے۔ اس دن کے قیمتی لمحات کو فضول مشاغل اور غفلت میں ضائع نہیں کرنا چاہیے، بلکہ زیادہ سے زیادہ عبادت کر کے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور مغفرت سے اپنا دامن بھرنا چاہیے۔ ساتھ ہی اپنے اہلِ خانہ، دوستوں اور معاشرے کے دیگر افراد کو بھی جمعہ کی فضیلت سے آگاہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ بھی اس بابرکت دن کی سعادتوں سے مستفید ہو سکیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ جس دن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے ہفتہ وار عید بنایا، اسی دن بہت سے مسلمان نمازِ جمعہ سے غفلت برتتے ہیں یا محض رسمی حاضری پر اکتفا کرتے ہیں۔ حالانکہ جمعہ کا حقیقی تقاضا یہ ہے کہ ہم اس دن کو عبادت، تقویٰ، ذکرِ الٰہی اور اتباعِ سنت کے ساتھ گزاریں اور اپنی عملی زندگی کو اسلامی تعلیمات کے مطابق ڈھالیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جمعہ کے دن کی عظمت کو پہچاننے، اس کے آداب و احکام پر عمل کرنے، نمازِ جمعہ کی پابندی کرنے، کثرت سے درود شریف پڑھنے، تلاوتِ قرآن کرنے اور اس بابرکت دن کی رحمتوں اور برکتوں سے بھرپور استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



بچوں میں دینی شعور بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اسلامی معلومات فراہم کی جائیں، دینی واقعات، مذہبی ثقافت اور اسلامی تاریخ سے روشناس کرایا جائے۔ اگر بچے کم عمری ہی سے اسلامی تاریخ، ثقافت اور ادب کے موضوعات پر توجہ دیں گے تو ان کا مستقبل یقیناً پُر نور اور تابناک ہو گا۔

اس کالم میں چند سوالات اور ان کے جوابات شامل ہیں۔ طلبہ و طالبات سے گزارش ہے کہ ہر سوال کو اس کے درست جواب کے ساتھ ملا کر درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر ارسال کریں۔ آپ کے درست جوابات آئندہ شمارے میں آپ کے نام کے ساتھ شائع کیے جائیں گے۔ (ادارہ)

مدیر کا وہاٹس ایپ نمبر +27838463037

سوالات	جوابات
سوال 1: سب سے پہلے خدا ہونے کا دعوی کس نے کیا؟۔	احد
سوال 2: سب سے پہلے زمین میں پودا کس نے لگایا؟	حضرت جبریل
سوال 3: فتاوی رضویہ کس کی کتاب ہے؟	علامہ نعیم الدین
سوال 4: خزائن العرفان کس کی کتاب ہے	امام احمد رضا
سوال 5: حضرت بلال سے بھی پہلے کس نے اذان کہی؟	حضرت آدم
سوال 6: اللہ کے نزدیک کون سا پہاڑ سب سے افضل ہے؟	شداد
سوال 7: سب سے پہلے خانہ کعبہ کا حج اور طواف کس نے کیا؟	ملائکہ
سوال 8: وہ کون سے صحابی ہیں جن کی شکل میں حضرت جبرئیل تشریف لاتے تھے؟	حضرت دحیہ کلبی
سوال 9: وہ کون سے صحابی ہیں جن کا انتقال سب سے بعد میں ہوا؟	زید بن حارثہ
سوال 10: وہ کون سے صحابی ہیں جن کو حضور ﷺ نے اپنا بیٹا بنالیا تھا؟	ابو طفیل عامر بن واثلہ

تشکر و تحسین

ماہنامہ الغوث (جون 2026) کے سوال و جواب کارنر میں صحیح جوابات ارسال کرنے والے معزز قارئین کے اسما

آصف رضا
املی آدم خاں، سہسرام

ناصرین پروین
بوکارو، جھارکھنڈ

ثانیہ منان
سہسرام

نجینہ پروین
بوکارو، جھارکھنڈ

شمیلہ اختری اصدقی
دھنباد، جھارکھنڈ

سوال و جواب کے کارنر میں شرکت کرنے اور جوابات ارسال کرنے پر ہم آپ تمام کے ذوق علم اور شوق مطالعہ کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ تعالی آپ تمام کو حسنات و برکات سے مالامال فرمائے اور خیر کثیر سے نوازے۔ آمین

(ادارہ)